جُمادی الاُخریٰ ۱۴۴۲ھ
فروری ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- مستقبل اسلام کا ہے! — علامہ ناصر الدین البانیؒ
- دستورِ حیات — سید ابوالحسن علی ندویؒ

داعیٔ رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول: سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن — صفحات:360، قیمت 550 روپے
حصہ دوم: سورۃ آل عمران تا سورۃ المائدہ — صفحات 326، قیمت 550 روپے
حصہ سوم: سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ — صفحات 331، قیمت 550 روپے
حصہ چہارم: سورۃ یونس تا سورۃ الکہف — صفحات 394، قیمت 600 روپے
حصہ پنجم: سورۃ مریم تا سورۃ السجدۃ — صفحات 480، قیمت 825 روپے
حصہ ششم: سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات — صفحات 484، قیمت 825 روپے
حصہ ہفتم: سورۃ قٓ تا سورۃ النّاس — صفحات 560، قیمت 900 روپے
(مکمل سیٹ: 4800 روپے)

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 70

شمارہ : 2

جُمادی الاُخریٰ 1442ھ

فروری 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرونِ ملک 400 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321
publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی: ''دارُالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

احیائے اسلام: جماعت سازی' خدشات اور تدارک — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 9

سورۃ الذّٰرِیٰت (مکمل) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نویدِ خلافت — 25

مستقبل اسلام کا ہے! — علامہ ناصر الدین البانیؒ

حاصلِ مطالعہ — 31

دستورِ حیات — سید ابوالحسن علی ندویؒ

راہِ عمل — 45

خوشگوار زندگی کے سنہری اصول — عبدالرحمٰن ناصر السعدی

انوارِ ھدایت — 61

اسلام میں نماز کا حکم اور اس کی تاکید — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

افکار و آراء — 67

اہلِ کلیسا کے اختیارات کی کہانی — رضی الدین سیّد

ظروف و احوال — 71

تاریخِ یہود اور مسئلہ فلسطین — ڈاکٹر ساجد خاکوانی

گوھرِ دریائے قرآن — 85

چند مشہور عربی تفاسیر اور ان کی خصوصیات (۲) — پروفیسر حافظ محمد قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

احیائے اسلام:

جماعت سازی‘ خدشات اور تدارک

انسان کا معاملہ بہت عجیب ہے‘ وہ اکیلا اس دنیا میں آتا ہے اور اکیلا ہی دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ لیکن وہ مہد سے لحد تک کا سفر نہ اکیلا کرنا چاہتا ہے اور نہ اکیلا کر سکتا ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد‘ کسی قبیلے کے رُکن‘ کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ اِسی لیے انسان کو معاشرتی حیوان کہا جاتا ہے‘ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کے لیے معاشرے کی وہی حیثیت ہے جو مچھلی کے لیے پانی کی ہے۔ انسان کی انفرادیت بڑی محدود ہے۔ وہ چھوٹے موٹے روزمرّہ اُمور میں سے بعض تنہا ہی کر لیتا ہے۔ وہ غور وفکر اور عملی طور پر کسی کام کا آغاز تو تنہا کر سکتا ہے‘ لیکن تنہا کسی ایسے کام کو منطقی انجام تک نہیں پہنچا سکتا جو معاشرے پر اچھے یا بُرے اثرات مرتّب کرے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اجتماعیت انسانی فطرت کا حصّہ ہے۔ لہٰذا انسان کی فطرت کی رُو سے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لیے سازگار معاشرہ تلاش کرے‘ اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنی اخلاقی و روحانی تکمیل کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جِدّوجُہد کرے۔ مقصد کے حصول کے لیے اجتماعی دانش اور اجتماعی جِدّوجُہد انسان کی ضرورت ہی نہیں مجبوری بھی ہے۔

انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد بلاشبہ افراد کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات ہے‘ لیکن اس مقصد کے لیے سازگار اجتماعی ماحول مہیّا کرنے کی جِدّوجُہد کرنا بھی بلاشبہ انبیاء و رسلؑ کے مقاصدِ بعثت اور فرائض ہائے منصبی میں شامل رہا ہے۔ عام انسان کی بات چھوڑیں‘ انبیاء اور رسلؑ نے بھی اپنے مشن کا آغاز تو تن تنہا کیا‘ لیکن حواریین اور صحابہ کرامؓ کی نصرت سے ہی مشن آگے بڑھا۔

اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم رسولوں میں سے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے ایک طرف تو اپنی قوم بنی اسرائیل پر ہونے والے سیاسی جبر و استحصال کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی معجزانہ مدد کے نتیجے میں اپنی قوم کی آزادی‘ کتاب و شریعت کے

اُتارے جانے اور ایک جماعت فراہم ہوجانے کے بعد اس کے نفاذ کے لیے اپنی قوم سے اجتماعی جِدّوجُہد کا مطالبہ کیا۔ لیکن قوم کی بزدلی آڑے آئی‘ بات آگے نہ بڑھ سکی اور دین نافذ نہ ہوسکا۔

اللہ کے آخری نبی اور رسول محمد مصطفیٰ ﷺ نے آ کر پہلی مرتبہ پوری انسانیت کو ایک محفوظ کتاب قرآن مجید کے ذریعے ایک کامل دین کی طرف نہ صرف دعوت دی بلکہ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کی سمع و طاعت کے ٹھیٹھ اسلامی اُصول پر ایک مضبوط جماعت بنائی۔ اس جماعت نے مال و جان کی جس طرح قربانیاں دیں اور جس جانفشانی سے اِس مشن کے لیے وہ جُت گئے انسانی تاریخ اُس کی مثال دینے سے قاصر ہے۔ اور بالآخر فتح مکہ پر حضور ﷺ کے تکبیرِ ربّ کے اُس مشن کی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک تکمیل ہوگئی جس کا حکم آپؐ کو سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات میں دیا گیا تھا۔ اور خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ شہادت علی الناس کا یہ فریضہ اپنی اُمت کو منتقل کر کے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ حضور ﷺ نے جو نظامِ عدل و قسط قائم کیا خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اُسے نہ صرف نکھارا بلکہ صرف تیس برس کے قلیل عرصے میں تین براعظموں تک پھیلا دیا۔ لیکن خلافتِ راشدہ کے اختتام پر‘ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اختیار کردہ تعبیر کے مطابق‘ دینِ حق کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی چھ منزلہ عمارت کی صرف چھٹی منزل منہدم ہوئی۔ بقیہ پانچوں منزلوں کو ایک ایک کر کے گرنے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال لگے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ عمارت راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ یعنی مسلمانوں نے خود ادارۂ خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ عمارت جو اپنوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے اور غیروں کی سازشوں سے زمین بوس ہوگئی تھی اُسے ازسرِنو کھڑا کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کیا رحمۃ للعالمین ﷺ کے دیے ہوئے اُس عادلانہ نظام کو ماضی کا قصہ سمجھ لیا جائے؟ ہماری نظر میں ایسا کرنا صرف اپنی دنیا اور آخرت تباہ و برباد کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انسانیت سے دشمنی کا مظہر بھی ہے۔ ایسا کرنا انسانیت کو آگ کے سمندر میں پھینکنے کے مترادف ہے۔ آج دنیا ٹیکنالوجی میں انتہائی ترقی کے باوجود اور انسانوں کو زندگی میں بے شمار سہولتیں فراہم کرنے کے باوجود جہنّم زار بنتی چلی جا رہی ہے۔ لہٰذا اُس عادلانہ نظام کو واپس لائے بغیر چارہ نہیں!

عالمِ اسلام کی حالت یہ ہے کہ ہر گزرتا ہوا دن مسلمانوں کی پسپائی اور ہزیمت کی داستان سنا رہا ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کا اب کوئی حقیقی وجود نہیں ہے‘ مختلف مسلمان ممالک ہیں‘ جہاں مغرب کا سیاسی اور معاشی نظام اپنا قبضہ مکمل کر چکا ہے اور روشن خیالی کے ٹائٹل کے ساتھ مغربی تہذیب و

تمدن بھی اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ یہ ہمہ جہتی یلغار اتنی کامیابی سے سرایت کر گئی ہے کہ آج کے اسلامی دانشور اور مفکّر خود سیاسی اِسلام پر انگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ ایسے سوال کھڑے کیے جا رہے ہیں کہ اِسلامی نظام کے قیام کی جدّوجُہد کسی اِسلامی معاشرے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ یہ وہ دانشور ہیں جو ”آسان اسلام“ کے قائل ہیں۔ وہ بدقسمتی سے گمراہی کی راہ پر گامزن ہیں اور شریعت میں ترمیم وتحریف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً سود لینا حرام اور ناجائز‘ لیکن دینا حلال اور جائز۔ وہ عورت کو اپنے تئیں ”پردے کی جکڑ بندیوں“ سے آزاد کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں جمہوری نظام کے حوالے سے پروفیسر فرانسس فوکو یاما کے فلسفہ End of History کے شدت سے قائل ہیں۔ ہمیں اِن دانشوروں سے کچھ لینا دینا نہیں۔

البتہ دین سے انتہائی مخلص کچھ دانشور جو شریعتِ محمدی ﷺ کو مِن وعَن قبول کرتے ہیں اور اُس پر عمل پیرا بھی نظر آتے ہیں‘ ہم اُن کی علمی صلاحیتوں اور علمی کاوشوں کے دل کی گہرائیوں سے معترف ہیں اور اُنھیں بڑی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں‘ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ وہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد اور اُس کے لیے منظّم جماعت کا قیام غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں۔

ایسے ہی ایک صاحبِ علم کے سامنے ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے چند سوالات رکھے تھے‘ جن کا ہم قارئین کے سامنے اعادہ کیے دیتے ہیں۔ پہلا سوال یہ تھا کہ اگر کسی ملک کی آبادی کی عظیم اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہو تو اُس ملک میں کون سا نظام رائج ہونا چاہیے‘ اِسلامی نظام یا کوئی دوسرا نظام؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر بدقسمتی سے وہاں اسلامی نظام قائم نہیں بلکہ غیروں کا نظام نافذ ہے تو مسلمان باشندوں کو اِسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے یا نہیں؟ اور کیا یہ کوشش ہر مسلمان انفرادی طور پر اپنے تئیں کرتا رہے یا اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی منظّم جماعت کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے ہر ذی شعور ہی نہیں ذی ہوش بھی یہ کہے گا کہ مسلمانوں کو ایک منظّم جماعت بنا کر اِسلامی نظام کے قیام کی جدّوجُہد کرنا چاہیے۔ یہی جواب اُن صاحبِ علم نے بھی دیا تھا۔ ہم اِس میں یہ اضافہ کیے دیتے ہیں کہ اگر یہ اِسلامی ملک پاکستان ہو تو بات اخلاقی ہی نہیں دینی سطح پر مزید مؤکّد ہو جاتی ہے‘ کیونکہ مسلمانانِ پاکستان نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اُنھیں ایک خطہ زمین عطا فرما دے تو وہ اُس میں اُس کا دین نافذ کریں گے۔

جہاں تک اِس مقصد کے حصول کے لیے جماعت کی ضرورت واہمیت کی بات ہے تو ایک طرف حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر محمد مصطفیٰ ﷺ تک سلسلۂ رسالت پر نظر ڈالی جائے اور

دوسری طرف اُنیسویں اور بیسویں صدی میں سائنسی ترقی اور صنعتی وثقافتی انقلابات کے نتیجے میں دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ارتقائے زمانہ کے نتیجے میں انفرادیت کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کی اہمیت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ لہٰذا آج اجتماعیت کی ناگزیریت پہلے سے کہیں زیادہ عیاں ہو رہی ہے۔ دینِ اسلام کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ دو افراد کو بھی سفر اور نماز میں جماعت کی صورت میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔

جماعت سازی کے حوالے سے کچھ اندیشوں کا بڑی شدّت سے اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس سے جماعتی وگروہی عصبیت کی لعنت اور شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اوّلین بات تو یہ ہے کہ کون سا بڑا کام ہے جو اندیشوں سے خالی ہوتا ہے۔ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اُس کو اختیار کرنا چاہیے اور اس کے اندیشوں سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔

”شخصیت پرستی“ کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں صرف کسی ایک داعی کے اپنے خیالات ونظریات وتصوّرات اور اسی کے فہم وفکر کو ہی اس اجتماعیت میں ایک ایسے مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہو جائے جس پر کبھی کوئی سوال ہی نہ اُٹھایا جا سکے۔ اس کے برعکس اگر بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق پر غور کرتے رہیں اور مسلسل اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو ان شاء اللہ اس اندیشے کا سدِّباب ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ دین کی خدمت کے لیے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اِنَّنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کے مطابق اپنے آپ کو اُمّتِ مُسلمہ ہی کا ایک حصہ تصوّر کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور وگھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے ”چیزے دگر“ ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر وبرتر تصوّر کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ تفرقہ بازی محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی اس کا سبب بن سکتا ہے‘ کیونکہ درس گاہوں اور دارالعلوم نے جہاں اسلامی تعلیمات عام کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے وہاں یہ بھی ہوا کہ دینِ اسلام کو اپنے مسلک تک محدود کرنے کا طرزِ عمل سامنے آیا جو من دیگرم تو دیگری کی بنیاد بنا۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے ہی بند کر دیے جائیں اور نہ ہی یہ درست ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔

(باقی صفحہ 66 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورَةُ الذّٰرِیٰت

تمہیدی کلمات

سورۃ الذّاریات کا آغاز چار قسموں سے ہو رہا ہے۔اس انداز سے شروع ہونے والی یہ قرآن مجید کی دوسری سورت ہے۔اس سے پہلے ۲۳ویں پارے میں سورۃ الصّٰفّٰت ہے جس کے آغاز میں بالکل اسی انداز میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں:

﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ۝۳ اِنَّ اِلٰـھَکُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾

''قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو قطار در قطار صفیں باندھے حاضر رہتے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو ڈانٹنے والے ہیں۔ پھر قسم ہے اُن کی جو تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی۔ یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے۔''

سورۃ الصّٰفّٰت کا تعلق سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس گروپ کا مرکزی مضمون توحید ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے آغاز کی تین قسموں کے مقسم علیہ کا تعلق بھی توحید سے ہے:﴿اِنَّ اِلٰـھَکُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾ کہ یقیناً تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے۔زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں کا مرکزی مضمون چونکہ انذارِ آخرت ہے اس لیے سورۃ الذاریات کی قسموں کے بعد قیامت اور جزا وسزا کے واقع ہونے کی تصدیق کی گئی ہے:﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾

جس طرح سورۃ الصّٰفّٰت کی قسموں کے بارے میں تقریباً سب علمائے تفسیر کا اتفاق ہے کہ وہ قسمیں فرشتوں کے بارے میں ہیں'اسی طرح سورۃ الذّٰرِیٰت کی قسموں کے بارے میں بھی تقریباً سب مفسرین متفق ہیں کہ ان میں ہواؤں کا ذکر ہے۔

آیات ۱ تا ۲۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

وَ الذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝۱ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۝۳
فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّ اِنَّ الدِّیْنَ
لَوَاقِعٌ ۝۶ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُکِ ۝۷ اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸
یُّؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ ۝۹ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝۱۰ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ
غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ ۝۱۱ یَسْـَٔلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ ۝۱۲ یَوْمَ ھُمْ عَلَی
النَّارِ یُفْتَنُوْنَ ۝۱۳ ذُوْقُوْا فِتْنَتَکُمْ ؕ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۴ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝۱۵ اٰخِذِیْنَ مَآ
اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ ؕ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُحْسِنِیْنَ ۝۱۶ کَانُوْا قَلِیْلًا
مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ ۝۱۷ وَبِالْاَسْحَارِ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۱۸ وَ فِیْٓ
اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۱۹ وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ
لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝۲۰ وَ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۲۱ وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ
وَ مَا تُوْعَدُوْنَ ۝۲۲ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ
اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ ۝۲۳

آیت ۱ ﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝۱﴾ ''قسم ہے اُن ہواؤں کی جو بکھیرنے والی ہیں جیسے کہ بکھیرا جاتا ہے۔''

ہوائیں بہت سی چیزوں کو بکھیرتی ہیں۔مثلاً پودوں کے پھولوں کے زردانے(pollens) ہواؤں کی مدد سے ایک پودے سے دوسرے تک پہنچ کر اسے بارور کرتے ہیں۔اسی طرح بہت سے درختوں کے بیج ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے دور دراز علاقوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یوں ہوائیں پودوں کے پھلنے پھولنے اور جنگلات کے بڑھانے میں بھی مدد دیتی ہیں۔

آیت ۲ ﴿فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝۲﴾ ''پھر بوجھ اٹھا کر لانے والی ہیں۔''

ہوائیں اربوں کھربوں ٹن پانی سمندر سے اٹھا کر بادلوں کی شکل میں ہزاروں میل دور لے

جاتی ہیں اور پھر مختلف علاقوں میں بارش برساتی ہیں۔

آیت ۳ ﴿فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۞﴾ ''پھر نرمی سے چلنے والی ہیں۔''

کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس طرح چلتی ہے کہ اس کے ہلکے ہلکے جھونکے نباتات و حیوانات سب کے لیے بہت فرحت بخش ہوتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۞﴾ ''پھر اللہ کے امر کو تقسیم کرنے والی ہیں۔''

اس سے مراد بارش کے پانی کی تقسیم ہے۔ بادل کی شکل میں سمندر کے پانی کو ہوائیں مختلف علاقوں میں اڑائے پھرتی ہیں' مگر کس جگہ بارش ہوگی اور کس جگہ نہیں ہوگی اور جہاں ہوگی وہاں کس قدر ہوگی' یہ سب کچھ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس امر (حکم) کی تقسیم ہواؤں کے ذریعے سے ہی ہوتی ہے۔ اس تقسیم کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض علاقوں میں بارش سے جل تھل ہو جاتا ہے اور کچھ علاقے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے رہ جاتے ہیں اور کالی گھٹائیں ان کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔

ان آیات میں ہواؤں کی قسمیں کھا کر اور پھر ان کے ذریعے طے پانے والے بعض امور کا ذکر کر کے دراصل کائنات کے محکم نظام پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر انسان اس بارے میں غور کرے گا تو وہ ضرور اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بنائی ہے: ((اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ))[1] ''یہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

آیت ۵ ﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۞﴾ ''جو وعدہ تمہیں دیا جا رہا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔''

آیت ۶ ﴿وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ ۞﴾ ''اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی۔''

یہ کائنات اور اس کا نظام گواہ ہے کہ بعث بعد الموت' نفخہ اولیٰ' نفخہ ثانیہ وغیرہ سے متعلق جو خبریں تمہیں دی جا رہی ہیں وہ یقیناً سچی ہیں اور جس عذاب کی تمہیں وعید سنائی جا رہی ہے اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ قیامت ضرور قائم ہوگی اور اس دن تمام انسانوں کو پھر سے ضرور زندہ کیا جائے گا اور انہیں ان کے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا۔

آیت ۷ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُکِ ۞﴾ ''اور قسم ہے جالی دار آسمان کی۔''

۱۔ تخریج الاحیاء للعراقی ۲۵۲/۳۔ حافظ عراقی نے اس حدیث کو منقطع قرار دیا ہے۔

یہ اس منظر کی طرف اشارہ ہے جو رات کے وقت تاروں بھرا آسمان پیش کرتا ہے۔

آیت ۸ ﴿اِنَّکُمۡ لَفِیۡ قَوۡلٍ مُّخۡتَلِفٍ ۞﴾ ''یقیناً تم لوگ ایک جھگڑے کی بات میں پڑ گئے ہو۔''

یعنی آخرت کے بارے میں تم ایک اختلاف میں پڑ گئے ہو اور تمہاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

آیت ۹ ﴿یُّؤۡفَکُ عَنۡہُ مَنۡ اُفِکَ ۞﴾ ''اس سے وہی پھیرا جاتا ہے جو پھیر دیا گیا ہے۔''

تم میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو وحی کے اس پیغام کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اور جزا و سزا کے متعلق مختلف باتیں بناتے رہتے ہیں۔ حالانکہ جزا و سزا کا معاملہ ایک بدیہی حقیقت ہے اور اس کو تسلیم کرنے سے وہی شخص باز رہے گا جو راندۂ درگاہ ہے اور خیر و سعادت کے راستوں سے پھیر دیا گیا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿قُتِلَ الۡخَرّٰصُوۡنَ ۞﴾ ''ہلاک ہو جائیں یہ اٹکلیں دوڑانے والے۔''

آیت ۱۱ ﴿الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ غَمۡرَۃٍ سَاہُوۡنَ ۞﴾ ''جو اپنی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

انہیں نہ تو اپنے مقصدِ تخلیق کی خبر ہے اور نہ اپنے انجام کی فکر۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اس عہد کو بھی بھولے ہوئے ہیں جو عالمِ ارواح میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں اس عہد کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

﴿وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ وَ اَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَہِدۡنَا ۚۛ﴾

''اور یاد کرو جب نکالا آپؐ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر' (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔''

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس عہد کا ''عرفان'' اس کی روح کے اندر موجود ہوتا ہے۔ لیکن دنیوی زندگی کے دوران بعض لوگوں کی ارواح غفلت میں اس قدر ڈوب جاتی ہیں کہ انہیں اپنے رب سے کیا ہوا یہ عہد یاد ہی نہیں رہتا۔ زیر مطالعہ آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے۔

آیت ۱۲ ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَ اَیَّانَ یَوۡمُ الدِّیۡنِ ۞﴾ ''وہ پوچھتے ہیں کب آئے گا وہ جزا و سزا کا دن!''

مشرکین یہ سوال طنزیہ انداز میں کرتے تھے کہ آپؐ کہتے رہتے ہیں کہ جزائے اعمال کا دن آ کر رہے گا‘ تو آخر کب تک آئے گا وہ روزِ جزا؟ چنانچہ ان کے اس سوال کا جواب بھی انہیں اسی انداز میں دیا جا رہا ہے:

آیت ۱۳ ﴿یَوۡمَ ہُمۡ عَلَی النَّارِ یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ ”جس دن یہ لوگ آگ پر سینکے جائیں گے۔“

چونکہ مشرکین یہ سوال غیر سنجیدہ انداز میں کرتے تھے اس لیے جواب میں ان کے لیے ڈانٹ کا انداز پایا جاتا ہے۔

آیت ۱۴ ﴿ذُوۡقُوۡا فِتۡنَتَکُمۡ ؕ ہٰذَا الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ ”(اُس دن ان سے کہا جائے گا:) اب چکھو مزا اپنی شرارت کا۔ یہ ہے وہ (عذاب) جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے۔“

تم لوگ ہمارے رسولؐ کو چیلنج کیا کرتے تھے نا کہ لے آؤ ہم پر عذاب اگر لا سکتے ہو۔ چنانچہ یہ ہے آج تمہارے اس مطالبے کا جواب۔ اب چکھو اس عذاب کا مزا!

آیت ۱۵ ﴿اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۵﴾﴾ ”یقیناً اہلِ تقویٰ باغات اور چشموں کے اندر ہوں گے۔“

آیت ۱۶ ﴿اٰخِذِیۡنَ مَاۤ اٰتٰہُمۡ رَبُّہُمۡ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ”وہ (شکریے کے ساتھ) لے رہے ہوں گے جو کچھ ان کا رب انہیں دے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس سے پہلے نیکوکار تھے۔“

یہ لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے نیک اعمال کی وجہ سے درجہ احسان تک پہنچے ہوئے تھے۔

آیت ۱۷ ﴿کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَہۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ”رات کا تھوڑا ہی حصّہ ہوتا تھا جس میں وہ سوتے تھے۔“

ان لوگوں کی راتوں کا بیشتر حصّہ اپنے رب کے حضور حاضری میں گزرتا تھا۔ سورۃ الفرقان میں ”عباد الرحمٰن“ کے اس معمول کا ذکر اس طرح آیا ہے: ﴿وَ الَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّہِمۡ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا ﴿۶۴﴾﴾ ”اور وہ لوگ راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور سجدے اور قیام کرتے ہوئے۔“

آیت ۱۸ ﴿وَ بِالۡاَسۡحَارِ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ”اور سحری کے اوقات میں وہ استغفار کرتے تھے۔“

آیت ۱۹ ﴿وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾﴾ ”اور ان کے اموال میں سائل اور محتاج کا حق ہوا کرتا تھا۔“

انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر رکھا تھا کہ ان کے پاس اللہ ربّ العالمین کا دیا جو کچھ بھی ہے اس میں فقراء و مساکین کا بھی حصّہ ہے اور وہ متعلقہ لوگوں کا حق ان تک پہنچایا بھی کرتے تھے۔

آیت ۲۰ ﴿وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ”اور زمین میں (ہر چہار طرف) نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے۔“

سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۶۴ (آیت الآیات) میں اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ”اور تمہاری اپنی جانوں میں بھی (نشانیاں ہیں)۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟“

یعنی انسان کے جسم اور جسم کے ایک ایک نظام کے اندر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے۔ مرزا بیدلؔ نے اس خوبصورت شعر میں اسی مضمون کی ترجمانی کی ہے: ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ!

اے انسان! بڑے ستم کی بات ہے اگر تجھے تیری خواہشِ نفس کسی باغ کی سیر کے لیے کھینچ کر لے جاتی ہے‘ جبکہ خود تیری اپنی چمک دمک کسی پھول سے کم نہیں ہے۔ کبھی اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس چمن کی سیر کے لیے بھی آؤ جو تمہاری روح کے اندر اللہ تعالیٰ نے مہکا رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی تخلیق اور اپنے وجود پر غور کرے اور اس اعتبار سے اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانے۔ بقول مرزا بیدلؔ: ؎

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!

(اس شعر کی تشریح سورۃ النحل کی آیت ۴۰ کے تحت بیان ہوئی ہے۔)

آیت ۲۲ ﴿وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ ”اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارا رزق بھی طے شدہ ہے اور تمہارے جنّت یا دوزخ میں جانے کا فیصلہ بھی اُسی کی مشیت سے ہونا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ ”تو آسمانوں اور زمین کے رب کی قسم‘ یقیناً یہ حق ہے‘ بالکل ایسے جیسے (اِس وقت) تم بات چیت کر رہے ہو۔“

یعنی بعث بعد الموت شدنی ہے‘ برحق ہے‘ قیامت آکر رہے گی۔

آیات ۲۴ تا ۴۶

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ
فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٢٥﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ
فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿٢٦﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢٧﴾
فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾
فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ
عَقِيْمٌ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٠﴾
قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣١﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ
مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿٣٣﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ
رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣٤﴾ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٣٥﴾
فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً
لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٣٧﴾ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى
فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ
مَجْنُوْنٌ ﴿٣٩﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿٤٠﴾
وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿٤١﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ

اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿٤٢﴾ وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ
تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٤٣﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ
وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿٤٤﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا
مُنْتَصِرِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٤٦﴾

آیت ۲۴ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾ ”کیا آپؐ کے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے؟!“

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب فرشتے انسانی شکلوں میں مہمان بن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے تھے۔

آیت ۲۵ ﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ﴾ ”جب وہ اس کے ہاں داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کہا۔“

﴿قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٢٥﴾﴾ ”اس نے بھی (جواب میں) سلام کہا (اور دل میں کہا کہ) یہ تو کوئی اجنبی لوگ ہیں۔“

آیت ۲۶ ﴿فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿٢٦﴾﴾ ”پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا اور ایک (بُھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لے آیا۔“

سورۂ ہود (آیت ۶۹) میں ”عِجْلٍ حَنِيْذٍ“ (بُھنا ہوا بچھڑا) کے الفاظ آئے ہیں۔ پرانے زمانے کی دعوتیں اسی انداز سے ہوا کرتی تھیں کہ جانور ذبح کیا اور گھی میں تل کر یا بُھون کر پورے کا پورا مہمانوں کے سامنے حاضر کر دیا۔

آیت ۲۷ ﴿فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾ ”پھر اسے ان کی طرف بڑھایا اور کہا کہ آپ لوگ کھاتے نہیں؟“

آیت ۲۸ ﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ﴾ ”تو اُس نے ان کی طرف سے دل میں اندیشہ محسوس کیا۔“

مہمانوں کے کھانا تناول نہ کرنے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اندیشہ لاحق ہوا کہ شاید یہ لوگ میرے دشمن ہیں‘ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور اسی لیے میرا نمک کھانے سے احتراز کر رہے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ دشمنی میں بھی شرافت دکھاتے تھے۔ اگر کسی کا نمک کھا لیا جاتا تو اس

کے بعد اسے نقصان پہنچانے کا نہیں سوچا جاتا تھا۔

﴿قَالُوۡا لَا تَخَفۡ ؕ﴾ ’’انہوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں۔‘‘

﴿وَ بَشَّرُوۡہُ بِغُلٰمٍ عَلِیۡمٍ ﴿۲۸﴾﴾ ’’اور انہوں نے اسے بشارت دی ایک صاحبِ علم بیٹے کی۔‘‘

صاحبِ علم بیٹے سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں جن کی پیدائش کی بشارت فرشتوں نے دی۔

آیت ۲۹ ﴿فَاَقۡبَلَتِ امۡرَاَتُہٗ فِیۡ صَرَّۃٍ فَصَکَّتۡ وَجۡہَہَا وَ قَالَتۡ عَجُوۡزٌ عَقِیۡمٌ ﴿۲۹﴾﴾ ’’اس پر اُس کی بیوی سامنے آئی بڑبڑاتی ہوئی اور اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور کہنے لگی: بڑھیا بانجھ (بچہ جنے گی کیا)؟‘‘

کہ میں تو ساری عمر بانجھ رہی ہوں اور اب تو میری عمر بھی ماں بننے کی نہیں رہی‘ تو کیا اب میرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا؟

آیت ۳۰ ﴿قَالُوۡا کَذٰلِکِ ۙ قَالَ رَبُّکِ ؕ﴾ ’’انہوں نے کہا: ایسا ہی فرمایا ہے آپ کے ربّ نے۔‘‘

فرشتے جو انسانی شکل میں تھے انہوں نے جواب دیا: یقیناً ایسے ہی ہوگا۔ ہم اپنی طرف سے یہ خبر نہیں دے رہے‘ بلکہ یہ آپ کے رب کا فیصلہ ہے۔

﴿اِنَّہٗ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۰﴾﴾ ’’یقیناً وہ بہت حکمت والا بھی ہے اور سب کچھ جاننے والا بھی۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿قَالَ فَمَا خَطۡبُکُمۡ اَیُّہَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ ’’ابراہیم نے پوچھا: اے ایلچیو! پھر آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے؟‘‘

آپ کا قصد اور ارادہ کیا ہے؟ کیا خصوصی مہم آپ کو درپیش ہے؟

آیت ۳۲ ﴿قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۲﴾﴾ ’’انہوں نے کہا: ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف۔‘‘

آیت ۳۳ ﴿لِنُرۡسِلَ عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۳۳﴾﴾ ’’تاکہ ہم ان پر بارش برسائیں کنکریوں کی۔‘‘

آیت ۳۴ ﴿مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’جو نشان زدہ ہیں آپ کے رب

کے پاس حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے ہر کنکری کو ان کے ایک خاص فرد کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو اس کے لیے گولی (bullet) کا کام کرے گی۔

آیت ۳۵ ﴿فَاَخۡرَجۡنَا مَنۡ کَانَ فِیۡہَا مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ’’پھر ہم نے نکال لیا جو بھی اس بستی میں تھے اہلِ ایمان۔‘‘

آیت ۳۶ ﴿فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡہَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ ’’تو نہیں پایا ہم نے اس میں سوائے ایک گھر کے کسی کو مسلمانوں میں سے۔‘‘

یعنی حضرت لوط علیہ السلام کے ایک گھر کے سوا اس پوری قوم میں اور کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔

آیت ۳۷ ﴿وَ تَرَکۡنَا فِیۡہَاۤ اٰیَۃً لِّلَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۳۷﴾﴾ ’’اور ہم نے اس میں ایک نشانی چھوڑ دی ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہوں دردناک عذاب سے۔‘‘

قومِ لوط کی بستیاں (سدوم اور عامورہ) سمندر کے کنارے پر آباد تھیں‘ جو اب بحیرۂ مُردار (Dead Sea) کہلاتا ہے۔ ان بستیوں کے بارے میں یہی اندازہ تھا کہ جب زلزلے سے یہ علاقہ تلپٹ ہوا ہوگا تو یہ بستیاں سمندر میں غرق ہوگئی ہوں گی۔ اب اس کی تصدیق بھی ہوگئی ہے اور بحیرۂ مُردار کی تہہ میں ان شہروں کے کھنڈرات کو دریافت بھی کر لیا گیا ہے۔ یہاں نشانی سے مراد یہی کھنڈرات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک لوگوں کی عبرت کے لیے ظاہر فرما دیا ہے۔

آیت ۳۸ ﴿وَ فِیۡ مُوۡسٰۤی اِذۡ اَرۡسَلۡنٰہُ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۸﴾﴾ ’’اور موسیٰؑ کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اسے بھیجا فرعون کی طرف کھلی سند دے کر۔‘‘

آیت ۳۹ ﴿فَتَوَلّٰی بِرُکۡنِہٖ﴾ ’’تو اُس نے منہ موڑ لیا اپنی شان وشوکت کے گھمنڈ میں‘‘

﴿وَ قَالَ سٰحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ﴿۳۹﴾﴾ ’’اور کہا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔‘‘

یعنی فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہی القابات دیے تھے جو اہلِ مکّہ حضور ﷺ کو دے رہے تھے۔

آیت ۴۰ ﴿فَاَخَذۡنٰہُ وَ جُنُوۡدَہٗ فَنَبَذۡنٰہُمۡ فِی الۡیَمِّ وَ ہُوَ مُلِیۡمٌ ﴿۴۰﴾﴾ ’’سو ہم نے پکڑا اُس کو اور اُس کے لشکروں کو اور انہیں پھینک دیا سمندر میں اور وہ ملامت زدہ تھا۔‘‘

آیت ۴۱ ﴿وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور قومِ عاد میں بھی (نشانی ہے) جب ہم نے اُن پر ایک ایسی ہوا چھوڑ دی تھی جو ہر خیر سے خالی تھی۔''

عَقِیْم کے معنی بانجھ کے ہیں' یعنی ایسا مرد یا ایسی عورت جس کے اولاد پیدا نہ ہوتی ہو۔ قبل ازیں آیت ۲۹ میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ اس مفہوم میں اَلرِّیْحَ الْعَقِیْمَ سے مراد ایسی ہوا ہے جو ہر قسم کی خیر سے خالی تھی۔

آیت ۴۲ ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ کَالرَّمِیْمِ ﴿۴۲﴾﴾ ''وہ نہیں چھوڑتی تھی کسی شے کو جس پر وہ آ جاتی تھی مگر اُس کو چورا چورا کر کے رکھ دیتی تھی۔''

آیت ۴۳ ﴿وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ ﴿۴۳﴾﴾ ''اور اسی طرح ثمود کے معاملے میں بھی (نشانی ہے) جب ان سے کہا گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے تم فائدہ اٹھا لو (دنیا کی نعمتوں سے)۔''

آیت ۴۴ ﴿فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ﴾ ''تو انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے''

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''تو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چنگھاڑ نے انہیں آ پکڑا۔''

آیت ۴۵ ﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِیَامٍ وَّمَا کَانُوْا مُنْتَصِرِیْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''تو نہ ان میں کھڑے ہونے کی سکت رہی اور نہ ہی اس قابل رہے کہ بدلہ لیتے۔''

یعنی نہ تو وہ اُٹھ ہی سکے اور نہ اپنا بچاؤ ہی کر سکے۔

آیت ۴۶ ﴿وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ﴾ ''اور قومِ نوحؑ کو بھی اس سے پہلے (ہم نے پکڑا)۔''

﴿اِنَّهُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''یقیناً وہ بھی بڑے ہی نافرمان لوگ تھے۔''

نوٹ کیجیے یہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے سوا ان سب پیغمبروں کا ذکر آ گیا ہے جن کے حالات طویل مکی سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یعنی سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں ایک ایک پیغمبر کا واقعہ عموماً ایک ایک رکوع میں بیان ہوا ہے لیکن یہاں ان کا ذکر ایک ایک دو دو آیات میں آیا ہے۔ گویا بعد میں نازل ہونے والی طویل مکی سورتوں میں انباء الرسل کی تفصیل بیان ہوئی ہے جبکہ زیرِ مطالعہ مکی سورتوں میں ان پیغمبروں کا ذکر انتہائی مختصر انداز میں آیا ہے۔

آیات ۴۷ تا ۶۰

وَ السَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا
فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ
تَذَکَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَفِرُّوْۤا اِلَی اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿ۚ۵۰﴾ وَ
لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿ۚ۵۱﴾
کَذٰلِکَ مَاۤ اَتَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ
اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿ۚ۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿ۚ۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ
فَمَاۤ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۫۵۴﴾ وَّ ذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۵﴾ وَ
مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ مَاۤ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ
رِّزْقٍ وَّ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ
الْمَتِیْنُ ﴿۵۸﴾ فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا
یَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ یَّوْمِهِمُ الَّذِیْ
یُوْعَدُوْنَ ﴿ۧ۶۰﴾

آیت ۴۷ ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور آسمان کو ہم نے بنایا اپنے ہاتھوں سے اور ہم (اس کو) توسیع دینے والے ہیں۔''

اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ کا ترجمہ عام طور پر ''ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں'' یا ''ہم بڑی قدرت والے ہیں'' کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن لغوی اعتبار سے اس کا یہ ترجمہ زیادہ مناسب اور زیادہ جامع ہے جو اوپر متن میں اختیار کیا گیا ہے۔ اَوْسَعَ یُوْسِعُ باب افعال ہے' جس کا مطلب ہے کشادہ کرنا' وسعت دینا۔ وَسِعَ ثلاثی مجرد ہے' جس سے اسم الفاعل وَاسِعٌ آتا ہے۔ چنانچہ ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ کا مطلب ہے: اللہ بڑی وسعت والا ہے' اس کے خزانے لامحدود ہیں۔ جبکہ مُوْسِع باب افعال سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معنی ہوں گے: وسعت دینے والا۔ اس لحاظ سے یہاں ﴿اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کائنات کو مسلسل وسعت بخش رہے ہیں' اسے وسیع سے وسیع تر کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ وہی بات ہے جو آج ہمیں سائنس کی مدد سے

معلوم ہوئی ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے تک انسان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر آج ہم جانتے ہیں کہ کائنات میں ہر گھڑی نئے نئے ستارے پیدا ہو رہے ہیں‘ ہر آن نئی نئی کہکشائیں وجود میں آ رہی ہیں اور یہ کائنات مسلسل پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ "Expanding Universe" کے اس تصوّر کو اقبالؔ نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے: ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُنْ فَیَکُوْن

اللہ تعالیٰ کی شانِ کُنْ فَیَکُوْن کا ظہور مسلسل جاری ہے۔ اسی مفہوم کو سورۂ فاطر کی پہلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ﴾ ''وہ اپنی تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا رہتا ہے''۔ چنانچہ وہ آسمانوں کو یعنی کائنات کو مسلسل وسعت دیے جا رہا ہے۔

آیت ۴۸ ﴿وَالۡاَرۡضَ فَرَشۡنٰہَا فَنِعۡمَ الۡمٰہِدُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور زمین کو ہم نے (فرش کی مانند) بچھا دیا‘ پس ہم کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں!''

آیت ۴۹ ﴿وَمِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم نصیحت اخذ کرو۔''

''جوڑوں'' کی تخلیق میں ہمارے لیے کس کس پہلو سے نصیحت کا سامان ہے؟ یہ جاننے کے لیے تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے۔ یہاں پر اس حوالے سے صرف یہ نکتہ سمجھ لیجیے کہ اس مفہوم کی آیات آخرت سے متعلق عقلی دلیل فراہم کرتی ہیں۔ یعنی جب ہر شے کا جوڑا ہے تو دنیا کا بھی تو جوڑا ہونا چاہیے اور ظاہر ہے دنیا کا جوڑا آخرت ہے۔

آیت ۵۰ ﴿فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۰﴾﴾ ''تو دوڑو اللہ کی طرف‘ یقیناً میں تم لوگوں کے لیے اُس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچ گیا ہے اور میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ گئی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں دیر نہ کرو۔ ممکن ہے فرشتے کو تمہاری جان قبض کرنے کا حکم بھی مل چکا ہو اور تمہاری مہلتِ عمل ختم ہونے کا وقت بالکل قریب آ لگا ہو۔

آیت ۵۱ ﴿وَلَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ؕ﴾ ''اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ ٹھہراؤ۔''

﴿اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۱﴾﴾ ''یقیناً میں اُس کی جانب سے تمہارے لیے واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔''

آیت ۵۲ ﴿کَذٰلِکَ مَاۤ اَتَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا قَالُوۡا سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ ﴿۵۲﴾﴾ ''اسی طرح (ہوتا آیا ہے کہ) نہیں آیا تھا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔''

آیت ۵۳ ﴿اَتَوَاصَوۡا بِہٖ ۚ﴾ ''کیا وہ ایک دوسرے کو وصیت کر گئے تھے اس کی؟''

یعنی جو باتیں آج سے صدیوں پہلے کے لوگ اپنے پیغمبروں سے کہتے تھے‘ عین وہی باتیں قریشِ مکّہ آج ہمارے آخری رسول ﷺ سے کہہ رہے ہیں۔ کیا ان کی ہر نسل دوسری نسل کو یہ باتیں وصیت میں بتا کر جاتی رہی ہے؟

﴿بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''بلکہ یہ ہیں ہی سرکش لوگ!''

ان کے رویّے کی یکسانی اور ایک ہی طرزِ جواب کی مسلسل تکرار کی وجہ یہ ہے کہ طغیان و سرکشی ان سب کا مشترک وصف ہے۔ چنانچہ اپنے اپنے پیغمبروں کے خلاف ان کے اعتراضات بھی ایک جیسے ہیں۔

آیت ۵۴ ﴿فَتَوَلَّ عَنۡہُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾﴾ ''پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے رُخ پھیر لیں‘ آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔''

یعنی اگر وہ آپ ﷺ کی مخالفت میں یہاں تک آ گئے ہیں کہ آپؐ کو شاعر‘ ساحر‘ مجنون اور معلَّم (سکھایا ہوا) تک کہہ رہے ہیں اور آپؐ کی دعوت سے مسلسل اعراض کر رہے ہیں تو اب آپ بھی اپنی توجّہ ان کی طرف سے ہٹا لیجیے۔ آپ محکم دلائل کے ساتھ ان پر اتمامِ حُجّت کر چکے ہیں۔ اگر یہ لوگ راہِ راست پر نہ آئے تو اس کی جواب دہی آپ سے نہیں ہو گی۔ لہٰذا آپ انہیں چھوڑ کر اُن لوگوں کی طرف اپنی توجّہ مرکوز کریں جو آپؐ کی بات کو سننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

آیت ۵۵ ﴿وَّذَکِّرۡ فَاِنَّ الذِّکۡرٰی تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''اور آپؐ تذکیر کرتے رہیے کیونکہ یہ تذکیر اہلِ ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔''

آپ ﷺ تعلیم و تبلیغ کی صورت میں تذکیر و یاددہانی کا سلسلہ جاری رکھیں۔ یہ سرکش لوگ اگر اس تذکیر کو نظرانداز کر رہے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں‘ اہلِ ایمان کے لیے تو یہ بہت مفید

ہے۔ آپ سے قرآن سن سن کر اہلِ ایمان کے ایمان میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

آیت ۵۶ ﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ ’’اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔‘‘

شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کی ترجمانی اس طرح کی ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی — زندگی بے بندگی شرمندگی!

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں تخلیقِ انسانی کی غایت بیان کی گئی ہے۔ کائنات کی تخلیق کے حوالے سے عام طور پر ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس تخلیق کا سبب کیا ہے؟ یہ ایک مشکل اور پیچیدہ سوال ہے جس کے جواب میں ہر زمانے کے فلاسفر اور حکماء نے اپنی اپنی آراء دی ہیں۔ یہ ان تفاصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ایک عام شخص کے لیے تخلیقِ کائنات کے سبب کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ضروری نہیں اور اس لاعلمی کی وجہ سے اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی نہیں۔ البتہ اپنی تخلیق کی غرض وغایت کے بارے میں جاننا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ اگر انسان کو اپنی غایتِ تخلیق ہی کا علم نہیں ہوگا تو گویا اس کی ساری زندگی رائیگاں جائے گی۔ چنانچہ اس آیت میں بنی نوعِ انسان کو ان کی غایتِ تخلیق واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ’’بندگی‘‘ کے لیے پیدا کیا ہے۔

بندگی یا عبادت کے بارے میں قبل ازیں بھی مَیں نے کئی مرتبہ وضاحت کی ہے کہ اس کے تین حصے ہیں: اوّلاً ہمہ تن اطاعت‘ ثانیاً اطاعت کی روح یعنی اللہ تعالیٰ کی غایت درجے کی محبت۔ عبادت اصلاً ان دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے (اَلۡعِبَادَۃُ تَجۡمَعُ اَصۡلَیۡنِ: غَایَۃَ الۡحُبِّ مَعَ غَایَۃِ الذُّلِّ وَالۡخُضُوۡعِ)۔ جبکہ تیسری چیز مراسمِ عبودیت ہے‘ جس کی حیثیت عبادت کے ظاہر یا جسم کی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کی حالت (قنوت) میں کھڑے ہونا (قیام)‘ رکوع‘ سجدہ‘ حمد یہ کلمات ادا کرنا‘ نماز وغیرہ مراسمِ عبودیت ہیں اور ان کی اپنی اہمیت ہے۔ اگر ہم عبادت کی اس تعریف (اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت) کی روشنی میں آج اپنی حالت کا جائزہ لیں تو یہ تلخ حقیقت واضح ہوگی کہ ہم میں سے جو لوگ اپنے زعم میں شب وروز پابندی کے ساتھ اللہ ربّ العزت کی عبادت پر کمربستہ ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ فیصد تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اس کا واضح تر مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگیوں کا غالب حصّہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی

اطاعت سے نکلا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس پر کافرانہ نظام کا غلبہ ہے اور اس نظام کے تحت رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن اطاعت ممکن ہی نہیں۔ ان حالات میں ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا عبادت کے تقاضوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جاننے کے خواہش مند حضرات اس موضوع پر میری کُتب اور تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آیت زیرِ مطالعہ کے حوالے سے یہاں پر مختصراً یہ سمجھ لیں کہ مادی وعلمی لحاظ سے انسان جس قدر چاہے ترقی کر لے اگر وہ اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا بندگی کے قالب میں ڈھالنے سے قاصر رہا تو انسانی سطح پر اس کی ساری زندگی بیکار اور رائیگاں ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے ان اشعار میں انسان کی اسی ناکامی کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

آیت ۵۷ ﴿مَاۤ اُرِیۡدُ مِنۡہُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ﴾ ’’مَیں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا‘‘ ﴿وَّمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ یُّطۡعِمُوۡنِ ﴿۵۷﴾﴾ ’’اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کھلائیں‘ پلائیں۔‘‘

آیت ۵۸ ﴿اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّۃِ الۡمَتِیۡنُ ﴿۵۸﴾﴾ ’’یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا‘ قوت والا‘ زبردست ہے۔‘‘

آیت ۵۹ ﴿فَاِنَّ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذَنُوۡبًا مِّثۡلَ ذَنُوۡبِ اَصۡحٰبِہِمۡ فَلَا یَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۵۹﴾﴾ ’’پس ان ظالموں کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کا پیمانہ لبریز ہوا تھا‘ سو یہ مجھ سے جلدی نہ مچائیں۔‘‘

’’ذَنُوب‘‘ ایسے ڈول کو کہتے ہیں جو پانی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا ہو۔ مراد یہ کہ زمانہ ماضی میں عذاب کا شکار ہونے والی اقوام کی طرح ان کُفّار ومشرکین کی بداعمالیوں کا ڈول بھی لبریز ہو چکا ہے اور یہ ڈول اب کسی وقت بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر فوری طور پر ان کی پکڑ نہیں بھی ہو رہی تو اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

آیت ۶۰ ﴿فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ یَّوۡمِہِمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۰﴾﴾ ’’تو ہلاکت اور بربادی ہے ان کافروں کے لیے اُس دن سے جس کا اُن سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔‘‘

مستقبل اسلام کا ہے!

محدث العصر ناصر الدین البانیؒ کی تالیف
'سلسلة الاحاديث الصحيحه' کا پہلا باب

ترجمہ: عطاء الرحمٰن ثاقب / خالد محمود خضر

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○﴾ (التوبة: ۳۳' الصف: ۹)

''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) دے کر مبعوث فرمایا' تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے' خواہ مشرکوں کو (یہ بات کیسی ہی) ناگوار گزرے۔''

یہ آیتِ کریمہ ہمیں بشارت دیتی ہے کہ مستقبل اسلام کا ہے' وہ تمام ادیان پر غالب آ کر رہے گا' اور مستقبل کی حکمرانی اور تسلّط اسلام کا مقدّر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غلبۂ اسلام کی یہ پیشین گوئی عہدِ نبویؐ' عہدِ خلافتِ راشدہ اور صالح بادشاہوں کے دور میں پوری ہو چکی ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بشارت اور سچے وعدے کا ایک جزء پورا ہو چکا ہے' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی اس حدیث میں اشارہ فرمایا:

((لَا يَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتّٰى تُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزّٰى' فَقَالَتْ عَائِشَةُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَاَظُنُّ حِيْنَ اَنْزَلَ اللّٰهُ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ اَنَّ ذٰلِكَ تَامًّا ' قَالَ : اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ مِنْ ذٰلِكَ مَا شَاءَ اللّٰهُ)).....الحديث

''دن رات اُس وقت تک ختم نہیں ہوں گے (یعنی قیامت نہیں آئے گی) جب تک (دوبارہ) لات اور عزّیٰ کی عبادت نہ کی جائے گی۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں تو یہ گمان کرتی تھی کہ جب اللہ نے آیت کریمہ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ نازل فرمائی تو (اس میں غلبۂ اسلام کی جو پیشین گوئی کی گئی ہے) وہ پوری ہو چکی! آپؐ نے فرمایا: اس پیشین گوئی کا کچھ حصّہ مستقبل میں پورا ہوگا' جتنا حصّہ اللہ چاہے گا!''

اس حدیث کو امام مسلمؒ اور دیگر ائمہ نے روایت کیا ہے' اور میں نے (امام البانی نے) اس کی تخریج اپنی کتاب ''تحذير الساجد من اتخاذ القبور مساجد'' (ص ۱۲۲) میں کی ہے۔

اس کے علاوہ بھی کچھ احادیث آئی ہیں جو اسلام کے عالمی غلبے اور اس کی وسیع نشر و اشاعت کی صراحت کرتی ہیں' جن کے ملاحظہ سے اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ اللہ کے حکم اور اس کی توفیق سے' مستقبل اسلام کا ہے! ذیل میں ہم ان میں سے بعض احادیث ذکر کر رہے ہیں' تاکہ یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے جِدّ وجُہد کرنے والوں کے لیے ہمت افزائی کا باعث ہوں اور اس سے مایوس ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہنے والوں کے لیے حُجّت ثابت ہوں۔

((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى (اى جَمَعَ وَضَمَّ) لِيَ الْاَرْضَ' فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا' وَاِنَّ اُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا))

''بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو لپیٹ دیا' چنانچہ میں نے اس کے تمام مشارق و مغارب دیکھے۔ اور یقیناً میری اُمّت کا اقتدار وہاں تک پہنچے گا جہاں تک زمین کو میرے لیے لپیٹا گیا!'' (یعنی اہلِ اسلام کا اقتدار کرۂ ارض کے کونے کونے پر قائم ہوگا۔)

اس حدیث کو مندرجہ ذیل ائمۂ حدیث نے روایت کیا ہے: مسلم (۱۷۱/۸)' ابوداوٗد (حدیث ۴۲۵۲)' ابن ماجہ (حدیث ۲۹۵۲)' ترمذی (۲/۲۷) اور امام ترمذیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ امام احمدؒ نے اسے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت (۵/ ۲۷۸' ۲۸۴) کے علاوہ حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت (۱۲۳/۴) سے بھی نقل کیا ہے۔

اور اس سے بھی واضح تر اور زیادہ عام حدیث یہ ہے:

((لَيَبْلُغَنَّ هٰذَا الْاَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ' وَلَا يَتْرُكُ اللّٰهُ بَيْتَ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ هٰذَا الدِّيْنَ - بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ —— عِزًّا يُعِزُّ اللّٰهُ بِهِ الْاِسْلَامَ ' وَذُلًّا يُذِلُّ بِهِ الْكُفْرَ))

''یہ دین (اسلام) لازماً وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک دن اور رات پہنچتے ہیں۔ اور

اللہ تعالیٰ نہ تو اینٹ گارے کا بنا ہوا کوئی (کچا یا پکا) مکان رہنے دے گا اور نہ ہی اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا خیمہ جہاں اللہ اس دین کو داخل نہ کر دے' کسی سعادت مند کو عزت دے کر یا کسی بدبخت کو ذلیل کر کے ـــــ ایسی عزت جس کے باعث اللہ اسلام کو سربلندی عطا فرمائے گا اور ایسی ذلت جس سے کفر کی طاقت کو کمزور کر دے گا!''

اس حدیث کو محدثین کی ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہے' جن کا مَیں نے اپنی کتاب ''تحذیر الساجد'' میں ذکر کیا ہے (ص ۱۲۱)۔ ابن حبان نے اسے اپنی ''صحیح'' میں بیان کیا ہے (۱۶۳۱' ۱۶۳۲) اور ابوعروبہ نے ''المنتقی منَ الطبقات'' میں ذکر کیا ہے (۱/۱۰/۲)۔

{نوٹ از مترجم: اسی مضمون کی ایک حدیث امام احمدؒ بن حنبل نے اپنی ''مسند'' میں حضرت مقداد بن الاسود ؓ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے' جسے امام خطیب تبریزیؒ نے اپنے شہرۂ آفاق مجموعۂ احادیث ''مشکوٰۃ المصابیح'' میں نقل کیا ہے (کتاب الایمان' حدیث ۴۱)۔ مسند احمد کی یہ حدیث مندرجہ بالا حدیث سے بھی زیادہ واضح اور صریح ہے' خاص طور پر اس میں ''بعزّ عزیز وذلّ وذلیل'' کی صراحت میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں ان سے اس کے مفہوم کی ٹھیک ٹھیک تعیین ہو جاتی ہے' لہٰذا ہم اس مضمون میں اس حدیث کا اضافہ کر رہے ہیں:}

عَنِ الْمِقْدَادِ (ؓ) اَنَّـهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ ـ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ ـ اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا' اَوْ يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا)) ـ قُلْتُ: ''فَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ''

حضرت مقداد ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا نہ اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے! خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر خواہ کسی بدبخت کی مغلوبیت کے ذریعے ـــــ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو عزت عطا فرما دے گا اور کلمۂ اسلام کا قائل و حامل بنا دے گا یا انہیں مغلوب فرما دے گا کہ اس کے محکوم بن جائیں!'' حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ اس پر مَیں نے (اپنے دل میں) کہا: ''پھر تو واقعتاً دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے گا!''

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کی اس قدر وسیع نشر و اشاعت کا تقاضا ہے کہ مسلمان مادی و

معنوی اور جدید ٹیکنالوجی کے لحاظ سے اس قدر مضبوط ہو جائیں گے کہ وہ کفر اور طاغوت کی طاقتوں کو آسانی سے زیر کر لیں گے۔ ذیل کی حدیث بھی ہمیں اسی کی بشارت دے رہی ہے:

عن ابی قبیل قَالَ : كُنَّا عِنْدَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ وَسُئِلَ اَىُّ الْمَدِيْنَتَيْنِ تُفْتَحُ اَوَّلًا: الْقُسْطُنْطِيْنِيَّةُ اَوْ رُوْمِيَّةُ؟ فَدَعَا عَبْدُ اللّٰهِ بِصُنْدُوقٍ لَهٗ حلقٌ' قَالَ : فَاَخْرَجَ مِنْهُ كِتَابًا[1] قَالَ : فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ : بَيْنَمَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ نَكْتُبُ ' اِذْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَىُّ الْمَدِيْنَتَيْنِ تُفْتَحُ اَوَّلًا: قُسْطُنْطِيْنِيَّةُ اَوْ رُوْمِيَّةُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَدِيْنَةُ هِرَقْلَ تُفْتَحُ اَوَّلًا يعنى قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ۔

''حضرت ابوقبیلؒ سے روایت ہے کہ ہم حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (ؓ) کے پاس بیٹھے تھے کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ قسطنطنیہ اور رومیہ دونوں شہروں میں سے کون سا شہر پہلے فتح ہو گا؟ حضرت عبداللہؓ نے دستوں (کڑوں) والا ایک صندوق منگوایا اور اس میں سے ایک کتاب نکالی۔[1] پھر حضرت عبداللہؓ فرمانے لگے: ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے (آپؐ کے فرمودات) لکھ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا: دونوں شہروں میں سے کون سا شہر پہلے فتح ہو گا۔ قسطنطنیہ یا رومیہ؟ تو آپؐ نے فرمایا: ہرقل کا شہر یعنی قسطنطنیہ پہلے فتح ہو گا۔''

اس حدیث کو امام احمد نے (۲/۱۷۶)' امام دارمی نے (۱/۱۲۶)' ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں (۷/۴۷/۱۵۳/۲)' امام ابوعمرو الدانی نے ''السنن الواردة فی الفتن'' میں (۲/۱۱۶)' امام حاکم نے ''المستدرک'' میں (۴۲۲/۳' ۵۰۸/۴) اور امام عبدالغنی المقدسی نے ''کتاب العلم'' میں (۲/۳۰/۱) روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث سنداً حسن ہے۔ امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے بھی ان سے اتفاق کیا ہے۔

''رومیہ'' سے مراد روم ہے' جیسا کہ ''معجم البلدان'' میں صراحت ہے۔ آج کل یہ اٹلی کا دار الخلافہ ہے۔ فتح اول (قسطنطنیہ کی فتح) سلطان محمد الفاتح العثمانی کے ہاتھوں نبی ﷺ کی بشارتِ فتح کے آٹھ سو سال بعد مکمل ہوئی۔ اور فتح ثانی (اٹلی کی فتح) بھی' جب اللہ چاہے گا'

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ کی اس حدیث کو ابوزرعہ نے بھی ''تاریخ دِمشق'' میں بیان کیا ہے (۱/۹۶) اور اس سے بعض عقلیت گزیدہ لوگوں کے گمان کے برعکس دورِ نبویؐ میں کتابتِ حدیث کا ثبوت ملتا ہے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں لازماً ہو کر رہے گی۔ اور ﴿وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِيۡنٍ ﴿٨٨﴾﴾ (صٓ) کے الفاظِ قرآنی کے مصداق کچھ عرصہ بعد اہلِ عالم اس کی خبر سن لیں گے۔

اور اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ فتح ثانی (اٹلی کی فتح) کے بعد اُمتِ مُسلمہ کو خلافتِ راشدہ کا دور پھر سے نصیب ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنی درج ذیل حدیث میں اسی کی بشارت دی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا فَيَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيًّا، فَتَكُوْنَ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ

"تمہارے اندر عہدِ نبوت جب تک اللہ چاہے گا موجود رہے گا۔ پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اس (عہدِ نبوت) کو ختم کر دے گا۔ (اس کے بعد) پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی‘ جو قائم رہے گی جب تک اللہ (اسے قائم رکھنا) چاہے گا‘ پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر (اس کی جگہ) کاٹ کھانے والی بادشاہت قائم ہو جائے گی‘ جو جب تک اللہ چاہے گا برقرار رہے گی۔ پھر جب اسے بھی اللہ ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر جابرانہ ملوکیت کا دور ہوگا‘ جو جب تک اللہ چاہے گا باقی رہے گا۔ پھر اللہ جب اسے بھی ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (دوبارہ) قائم ہو جائے گی۔ پھر آپؐ خاموش ہو گئے۔"

اس حدیث کو امام احمدؒ نے مسند احمد میں (۲۷۳/۴) ذکر کیا ہے۔ بعض حضرات اس حدیث کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد پر منطبق کرتے ہیں۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے:

"سلیمان بن داؤد طیالسی نے داؤد بن ابراہیم الواسطی سے‘ انہوں نے حبیب بن سالم سے‘ انہوں نے نعمان بن بشیرؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے‘ ایک صاحب بشیرؓ جو بہت کم حدیث بیان کرتے تھے‘ اُن سے ابوثعلبہ خشنیؓ نے پوچھا: اے بشیر بن سعد! امراء (حکام) کے متعلق آپ کو رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث یاد ہے؟ حذیفہؓ نے کہا: مجھے

آپ ﷺ کا ایک خطبہ یاد ہے۔ ابوثعلبہؓ بیٹھ گئے۔ حذیفہؓ نے اسے مرفوع بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ حبیب نے کہا: جب عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد کا آغاز ہوا اور یزید بن نعمان بن بشیرؓ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھیوں میں سے تھے‘ تو میں نے (حبیب نے) ان (یزید بن نعمان) کی طرف یہ حدیث لکھ کر روانہ کی۔ میں نے یہ بھی لکھا: مجھے اُمید ہے کہ اس حدیث میں کاٹ کھانے والی اور جابرانہ ملوکیت کے ادوار کے بعد جس خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا ذکر ہے اس سے امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہد ہی مراد ہے۔ انہوں نے میرا یہ خط عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں پیش کیا‘ وہ اس سے بہت خوش ہوئے۔"

حافظ عراقی نے اسے احمد کے واسطے سے "محجة القرب الى محبة العرب" میں بیان کیا ہے (۲/۱۷) اور کہا ہے: "یہ حدیث صحیح ہے اور ابراہیم بن داؤد طیالسی کو ابوداؤد طیالسی نے ثقہ قرار دیا ہے اور ابن حبان نے بھی۔ بقیہ رواۃ بھی مسلم شریف میں قابل احتجاج ہیں۔" لیکن امام بخاری نے حبیب کے متعلق کہا ہے: فيه نظر (یعنی اس میں نظر ہے)۔ ابن عدی کہتے ہیں: اس کی احادیث کے متن میں تو کوئی منکر روایت نہیں ہے‘ تاہم اس سے روایت کردہ احادیث کی اسانید میں اضطراب کا ثبوت ملتا ہے۔ بہرحال ابوحاتمؒ‘ ابوداؤد اور ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ پس اس کی حدیث کم سے کم حسن ضرور ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں: لا بأس به یعنی ان سے روایت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہ حدیث مسند طیالسی میں اس طرح سے ہے (حدیث نمبر ۴۳۸): ہم سے داؤد الواسطی نے روایت کیا —— اور وہ ثقہ ہے —— اُس نے کہا: میں نے یہ حبیب بن سالم سے سنی ہے۔ لیکن اس کے متن میں کچھ سقوط واقع ہوا ہے‘ جس کا استدراک "مسند احمد" سے ہو جاتا ہے۔ "المجمع" میں ہیثمی کہتے ہیں (۱۸۹/۵): اس حدیث کو احمد اور بزار نے بھی اس سے زیادہ مکمل صورت میں روایت کیا ہے اور طبرانی نے بھی اس کا کچھ حصہ "الاوسط" میں روایت کیا ہے"(۱)۔ اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔

میرے نزدیک اس حدیث کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد پر منطبق کرنا بہت دور کی بات ہے۔ اس لیے کہ ان کی خلافت کا زمانہ خلافتِ راشدہ کے قریب تھا اور وہ کاٹ کھانے والی اور جابرانہ بادشاہتوں کے دو ادوار کے بعد نہیں تھا۔ واللہ اعلم! ❁❁

(۱) طبرانی نے "الاوسط" میں جو حدیث روایت کی ہے وہ معاذ بن جبلؓ سے مرفوعاً روایت ہے۔

دستورِ حیات

سید ابوالحسن علی ندویؒ

تلخیص: ارسلان اللہ خان☆

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ؒ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کے صوبے اُتر پردیش کے شہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے' جو تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ آپ نے لکھنؤ کے علاقے رائے بریلی کے ایک علمی و ادبی خانوادے میں آنکھ کھولی۔ آپ نے اپنی تعلیم دُنیائے اسلام کے معروف علمی ادارے ''ندوۃ العلماء'' سے حاصل کی۔ آپ بیک وقت اردو' عربی اور فارسی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتب تحریر کیں جن سے آج بھی ایک خلقت استفادہ کر رہی ہے۔ آپ کے قلب میں اُمّتِ مُسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کا جذبہ موجزن تھا اور آپ وحدتِ اُمّت کے علمبردار تھے۔ آپ نے کئی اسلامی ممالک میں جا کر نہ صرف تقاریر کیں بلکہ اُن ممالک کے باشندوں کو اُن کے جغرافیائی خدوخال' وسائل اور حالات کے اعتبار سے کُفر کی یلغار سے بچنے کے لیے مفید مشورے بھی فراہم کیے۔ اُمّت کے احساس کی شدّت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو روشن قلب عطا کیا تھا جس کی مدد سے آپ نے بہت سی پیشین گوئیاں فرمائیں جو آج حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہی ہیں۔ مولاناؒ کی بہت سی علمی خدمات کی بدولت اُنہیں ۱۹۸۰ء میں سعودی عرب کی جانب سے کنگ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آخر کار ہندوستان کا یہ علمی چراغ اپنی روشنی سے ایک دُنیا کو منور کر کے ۱۹۹۹ء میں بجھ گیا۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

مولانا ابوالحسن ندویؒ نے یوں تو متعدد چھوٹی بڑی کتابیں تحریر کیں' لیکن آج ہم جس کتاب کا خُلاصہ پیش کرنا چاہ رہے ہیں وہ کتاب ہے ''دستورِ حیات''۔ یہ کتاب ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ اس کا مقدمہ پندرہ صفحات میں لکھا گیا ہے۔ مولاناؒ نے کتاب کے اندرونی سرورق پر بھی

☆ ای میل hanarsalanullah@gmail.com

کتاب کے عنوان کے تحت اس کتاب کا تعارف یوں پیش کیا ہے:

''کتاب اللہ اور سُنّت وسیرتِ نبویؐ کی روشنی میں ایک مسلمان کی زندگی کا مکمل دستور العمل' ہدایت نامہ اور نظامِ زندگی' عقائد' عبادات' اخلاق اور عادات وشمائل کے بارہ میں تعلیمات واسوۂ نبویؐ کی وضاحت اور اصلاح وتربیتِ نفس کے لیے قرآنی ونبویؐ ہدایات وتعلیمات۔''

مولاناؒ نے یہ کتاب پہلے عربی میں بعنوان ''العقیدة والعبادة والسلوك'' تحریر فرمائی اور پھر از خود اس کا اردو میں ''دستورِ حیات'' کے نام سے ترجمہ فرما دیا۔ اُنہوں نے اپنے مقدّمے کے آخری صفحے میں وضاحت کی ہے کہ جہاں اس کتاب میں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے مختلف ادوار میں لکھی گئی اَسلاف کی کُتب سے استفادہ کیا گیا ہے وہیں مولانا نے ذاتی تجربات اور مُطالعے کا نچوڑ اور اپنی گذشتہ تصانیف کے بعض اقتباسات بھی ''دستورِ حیات'' میں پیش کر دیے ہیں۔ آج جبکہ مسلمان ہر اعتبار سے اور بالخصوص اخلاقی معاملے میں شدید انحطاط پذیر ہیں' ایسے میں یہ کتاب عبادات ومعاملات اور اخلاق و عادات کے باب میں مسلمانوں کے لیے ایک ''دستور'' کی حیثیت رکھتی ہے۔

خُلاصہ دستورِ حیات

دینِ اسلام کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات

اسلام ہی وہ دین ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی' اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔''

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہمیں اُس دین سے وابستہ کیا ہے جو اس خلّاقِ عالَم نے جملہ انسانیت کے لیے چُن لیا ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس کی حفاظت کا ذمہ بھی از خود پروردگار ہی نے لیا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ خاتم النّبیّین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور اللہ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید کے بعد اب کوئی اور کتاب نہیں اُترے گی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید اپنی اصل حالت میں

موجود ہے بعینہٖ اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی سیرت وسنّت اور آپ ﷺ کے افکار واقوال اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۹﴾ (الحجر)

''بے شک ہم نے ہی یہ (کتاب) نصیحت اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

اس کے برعکس عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں تحریف ہو چکی ہے اور ان کے عقائد اور اعمال آسمانی دین سے بالکل مختلف ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیباچۂ قرآن یعنی سورۃ الفاتحہ میں عیسائیوں کو ''الضَّآلِّیۡنَ'' یعنی گمراہ اور یہودیوں کو ''المَغضُوب علَیھِم'' یعنی غضب شدہ قرار دیا گیا ہے۔

Ernest De Bunsen نے اپنی کتاب "Islam or True Christianity" میں لکھا ہے:

''جس عقیدے اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے اس کی دعوت حضرت مسیح نے اپنے قول اور عمل سے کبھی نہیں دی تھی۔''

جبکہ اسلام کا یہ اعجاز ہی اس کی سب سے بڑی فضیلت اور نمایاں خصوصیت ہے کہ بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ادا بھی سیرت کی کتب میں محفوظ ہے۔ چنانچہ قرآن وسنّت کے مستند امتزاج کی یہ موجودگی دراصل وہ بیرومیٹر (ہواپیما) ہے جس کے ذریعے عُلمائے اُمّت معروف ومنکر، سنّت وبدعت، اسلام اور جاہلیت کے مابین ہر دَور میں فرق کرنے کے قابل ہوئے اور الحمدللہ دین اسلام اپنی اُسی آب وتاب کے ساتھ برقرار ہے۔

دینِ اسلام آسمانی دین ہے۔ یہ دین ہم تک حکیموں، دانشوروں، ماہرینِ قانون، علمائے اخلاق ونفسیات، کشور کشا اور قانون ساز فلاسفہ یا سیاسی رہنماؤں اور قائدین کے ذریعے نہیں پہنچا، بلکہ اُس خاتم النّبیّین رسول ﷺ کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے جن پر وحی آتی تھی اور جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ۳ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۴﴾ (النجم)

''اور وہ خواہش نفس سے کوئی بات مُنہ سے نہیں نکالتے۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے، جو (ان کی طرف) وحی کے ذریعے بھیجا جاتا ہے۔''

دینِ اسلام کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار ''عقیدہ'' ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے

لے کر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیاءِ کرامؑ ایک معیّن عقیدے کی دعوت دیتے رہے اور اس پر مفاہمت یا اس سے دست برداری پر تیار نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی کردار، کامل نیکی، صالح معاشرہ اور بہتر حکومت کا قیام یا مفید انقلاب قابلِ قدر نہیں جب تک انسان اس عقیدے کا ماننے والا نہ ہو جسے وہ بحکمِ خدا لے کر آئے اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ واضح رہے کہ جس فکر کا سرچشمہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی تعلیمات نہ ہوں وہ ناقابلِ قبول ہے۔ ایسے قومی رہنما، سیاسی، انقلابی لیڈر جو آسمانی تعلیم کو چھوڑ کر کوئی نظریہ یا نظام برپا کریں تو اس کی مثال سورج کو چراغ دکھانے کی سی ہے، کیونکہ اسلامی عقیدہ اور وحی کی تعلیم ہی اصل تعلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عقیدہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ عقیدہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ سورۃ الکافرون جس میں کفرو بُت پرستی کو واضح طور پر چیلنج کیا گیا ہے، مکّہ مکرمہ میں اُس وقت نازل ہوئی جب حالات عبادت و عقیدہ کی بنیاد پر دشمن پیدا کرنے کے متقاضی نہ تھے۔

دراصل دعوت وتبلیغ کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ یہ کانٹوں کا بستر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے:

﴿فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ﴾ (العنکبوت:۱۴)

''وہ اپنی قوم میں پچاس برس کم ایک ہزار سال رہا۔''

لیکن اس طویل اور زہرہ گداز محنت اور جِدّوجُہد کا نتیجہ یہ رہا کہ:

﴿وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَہٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ ۴۰﴾ (ھود)

''ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے۔''

لیکن حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے راضی تھے اور اللہ بھی ان سے راضی تھا اور یہی آپؑ کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اسی طرح ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ دعوتِ اسلام کے لیے طائف تشریف لے گئے تو اہلِ طائف نے آپ ﷺ کے ساتھ ایسا جفا کارانہ اور وحشیانہ برتاؤ کیا جس کی مثال دعوت ورسالت کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے، لیکن آپ ﷺ اس نازک گھڑی اور سخت نفسیاتی حالت میں بھی اپنے رب سے دعائیں فرماتے رہے۔ اور پھر اس تبلیغ کا نتیجہ اس وقت نہ سہی لیکن آہستہ آہستہ نظر آنے لگا اور پھر ایک وقت آیا کہ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

آپ ﷺ نے اپنے صحابہ ؓ کی بہترین خطوط پر تربیت فرمائی۔ آپ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کا تربیت یافتہ گروہ آگے آیا اور انہی صحابہؓ نے دینِ اسلام کو آگے بڑھایا۔ یہ اصحابؓ کوئی عام لوگ نہ تھے‘ بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت میں استناد کا درجہ رکھتا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے عشقِ رسول ﷺ کو احکامِ خداوندی اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ بنا کر دنیا فتح کی۔ اسی عشقِ رسول ﷺ کی ایک لہر خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتی اور رگ و ریشہ اور جسم وجان میں اسی طرح دوڑتی کہ:

شاخِ گُل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اسی عشق کی آگ کے بغیر آج کی مسلم اکثریت کا حال بقول اقبال کچھ یوں ہے کہ:

بجھی عشق کی آگ‘ اندھیر ہے
مسلماں نہیں‘ راکھ کا ڈھیر ہے!

اہلِ سنّت والجماعت کے عقائد

سب سے اوّل اور سب سے اعلیٰ علم باری تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کا علم ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ ایم شنیدیم و خواندہ ایم
منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تُو ماندہ ایم!

جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو انبیاءِ کرام علیہم السلام کی آسمانی تعلیمات کے عین مطابق سمجھا اور جانا‘ ان کی حیات اور اُن کے معاملات پر اس کا بہترین اخلاقی اور روحانی اثر پڑا اور اس کے نتیجے میں اللہ وحدہ لاشریک کی حاکمیت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے بعد جو بھی دنیاوی علوم وفنون انہوں نے حاصل کیے اور آفاق وانفس میں جو غور وفکر کیا اس کا مقصد عمل صالح‘ تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق کا کام صحیح خطوط پر انجام دینا تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝۲۲﴾ (الاحزاب)

’’اور اس سے ان کے ایمان واطاعت ہی میں اضافہ وترقی ہوئی۔‘‘

تحقیق اور غور وفکر تو یونانی فلسفیوں نے بھی کیا۔ یہاں تک کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی آج جب علوم وفنون کی بات ہوتی ہے تو یونانیوں کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے‘ لیکن چونکہ وہ آسمانی علوم‘ خدا کی معرفت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے تہی دامن تھے اس لیے ان کے خیالات دیومالائی طرز کی اساطیر کا روپ دھارتے چلے گئے اور وہ قیاسات اور تخمینات کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ آج بھی ان کی باتیں انسان کو پریشان خیالی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ کوئی آسمانی تعلیمات کو چھوڑ کر خواہ کتنی ہی ترقی وکامیابی کی منازل طے کرلے‘ مگر وہ سب رائیگاں ہے۔

Greek Mythology یعنی یونانی اساطیر اور دیومالائی کہانیاں مشرکانہ اور احمقانہ فلسفوں اور تخیلات پر مبنی ہیں‘ لیکن اس کے باوجود اُس وقت کے ہی نہیں‘ آج کے فلسفی اور محقق بھی ان یونانی قصوں سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ امام غزالیؒ نے اپنی گراں قدر تصنیف ’’تهافة الفلاسفه‘‘ اور علامہ ابن خلدونؒ نے اپنے عظیم ’’مقدمہ‘‘ میں ذکر کی ہے کہ ہمیشہ سے انسانوں کی کمزوری رہی ہے کہ جب وہ کسی ایک شعبہ میں کسی فرد یا جماعت کا لوہا مان لیتے ہیں اور اس کے امتیاز وتفوق کو تسلیم کر لیتے ہیں تو دیگر تمام شعبوں میں بھی اس کی امامت کے قائل ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کے نظریات‘ فکر اور تہذیب کو اپنانا فخر سمجھتے ہیں اور اس اندھی تقلید کے معاملے میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اس کی فکر کو ہر طرح کی بحث وتحقیق سے مبرا سمجھ بیٹھتے ہیں۔

بنیادی اسلامی عقائد

ہر نظریہ کے کچھ مخصوص قوانین ہوتے ہیں جن سے انحراف اُس نظریے سے انحراف ہوتا ہے‘ چنانچہ ان بنیادی قوانین کو ’’عقائد‘‘ کہتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقائد مندرجہ ذیل ہیں:

☆ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
☆ وہ تمام عیوب سے پاک ہے۔
☆ وہ ہر شے پر قادر ہے۔
☆ وہ اکیلا ہے‘ سمیع (سننے والا) اور بصیر (دیکھنے والا) ہے۔ اور وہ اکیلا ہی کائنات کے انتظام وانصرام کو چلاتا ہے۔
☆ صرف وہی عبادت کا مستحق ہے۔

☆ مریض کو شفاء دینا' مخلوق کو رزق دینا' مشکل میں مدد کرنا اور تکلیف کو دور کرنا اُسی کا کام ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾﴾ (یٰسٓ)

''اُس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے فرمادیتا ہے ہوجا' تو وہ ہوجاتی ہے۔''

☆ اللہ تعالیٰ حلول واتحاد سے پاک ہے۔

☆ وہ کسی کا محتاج نہیں' سب اُس کے محتاج ہیں۔

☆ اچھی بُری تقدیر اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

☆ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جو ہر طرح کی تحریف اور کمی سے پاک ہے۔

☆ انبیاء کرامؑ' آسمانی کُتب' صحائف' جنّت ودوزخ' جزاء وسزا' پُل صراط' قیامت کا دن' یہ سب قرآن اور سنّت سے ثابت ہیں اور ان سب پر ایمان لانا لازمی ہے۔

توحید' دینِ خالص اور شرک کی حقیقت

عبودیت کی بنیاد عقائد اور ایمان کی درستگی پر ہے۔ جس کے عقائد میں خلل اور ایمان میں بگاڑ ہو' اُس کی نہ کوئی عبادت مقبول' نہ اُس کا کوئی عمل درست مانا جائے گا۔ اور جس کا عقیدہ درست اور ایمان صحیح ہو' اُس کا تھوڑا عمل بھی کفایت کرسکتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیے کہ توحید کے چار درجات ہیں:

۱) صرف خُدا تعالیٰ کو واجب الوجود قرار دینا۔

۲) قائم بالذات' ہر شے کا خالق اللہ تعالیٰ کو سمجھنا۔

۳) کائنات کے نظام کو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص سمجھنا۔

۴) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مستحق عبادت نہ گردانا۔

چنانچہ جو معاملہ بھی مندرجہ بالا نکات سے ٹکرائے گا وہ شرک کے زمرے میں آجائے گا۔

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی غیر اللہ کے ساتھ' خواہ وہ انسان ہو' جن ہو' فرشتہ ہو' حور ہو' بُت ہو' جانور ہو' کوئی بے جان شے ہو یا کوئی عفریت ہو' وہ معاملہ کرے جس کا سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کسی غیر اللہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ جیسا گمان رکھنا اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے'

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے بارے میں غضب کا اظہار فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے راہبوں' پادریوں اور پروہتوں کے بارے میں اس طرح مبالغہ وغلو کا طریقہ اختیار کیا جیسا معبودانِ باطلہ کے لیے مشرکین کرتے تھے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَہُمۡ وَ رُہۡبَانَہُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ الۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ ۚ وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡۤا اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ سُبۡحٰنَہٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ (التوبۃ)

''انہوں نے اپنے علماء ومشائخ اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا خدا بنالیا' حالانکہ اُن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خُدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں' اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔''

بدعت

کسی ایسی چیز کو جسے اللہ اور رسول ﷺ نے دین میں شامل نہیں کیا' دین میں ازخود شامل کرنا اور پھر اس کو ثواب کا ذریعہ سمجھنا اور اس کے نہ کرنے پر عتاب کا تصوّر قائم کرنا بدعت ہے۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)) (سنن ابی داؤد و سنن النسائی)

''اور (دین میں) نئی نئی باتوں سے بچتے رہو' اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے' اور ہر بدعت گمراہی ہے' اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے ہر دور میں ایسے وارثینِ رسول ﷺ پیدا فرمائے جنہوں نے بدعتوں کی بیخ کنی کر کے دین کو خالص کیا اور بے پناہ مخالفتوں اور اذیتوں کے باوجود لسانی اور قلمی جہاد کے ذریعے کئی بدعات کا معاشرے سے قلع قمع کر دیا۔

عبادات

عقائد کے بعد اسلام میں جس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ عبادت ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذاریات)

''اور مَیں نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

شریعتِ اسلامی میں عبادات کو سب سے زیادہ کامل ومکمل شکل میں پیش کیا گیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کو ان عبادات سے ایسا خاص عشق تھا جو احاطہ بیان سے باہر ہے۔ قرآن شریف کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلق مع اللہ‘ عبودیت و بزرگی اور عباداتِ معیّنہ بندۂ مسلم سے اس طرح مطلوب ومقصود ہیں کہ انہی کے متعلق روزِ حشر سب سے پہلا سوال ہوگا‘ خاص طور پر نماز کے بارے میں۔ فارسی کا یہ شعر مشہور ہے :

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اوّلیں پرسشِ نماز بود!

عبادات کے ارکانِ اربعہ: ۱) نماز ۲) زکوٰۃ ۳) روزہ ۴) حج

نماز

ان عبادات میں اوّلین اور اہم ترین رکن نماز ہے‘ جسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ قرآن وسُنّت میں جا بجا نماز کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور بار ہا اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ﴾ (العنکبوت:۴۵)

''کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

☆ بندہ اور کفر کے درمیان ترکِ نماز ہے۔ ☆ نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

پانچ وقت با جماعت نمازوں کے علاوہ جمعہ اور عیدین میں شرکت بھی ضروری ہے‘ اور مختلف نفل نمازیں پڑھ کر مؤمن اللہ کے قُرب تک پہنچ سکتا ہے۔ نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اہلِ جہنّم سے جہنّم میں جانے کا سبب دریافت کیا جائے گا تو قرآن کے بقول:

﴿قَالُوۡا لَمۡ نَکُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ (المدثر)

''وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔''

زکوٰۃ وصدقات

رسول اللہ ﷺ جود وسخا کا پیکر تھے۔ صدقات اور خیرات کا ایسا نظام آپ ﷺ نے

متعارف کرایا جو رہتی دنیا تک کے لیے ایک بہترین معاشی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ﷺ اپنے مال کو سب سے زیادہ صدقات وخیرات میں صرف فرماتے تھے۔ لوگوں کی مالی امداد کرنا آپ ﷺ کا محبوب عمل تھا۔ آپ ﷺ دے کر اتنا خوش ومسرور ہوئے تھے جتنا لینے والا لے کر نہیں ہوسکتا۔ زکوٰۃ کے بارے میں تمام اَحکام‘ مقدار‘ نصاب اور کس پر کب واجب ہے اور اس کے کیا مصارف ہیں‘ ہر اعتبار سے آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کامل ومکمل اور جامع ہے۔

روزہ

رمضان کے روزے مسلمانوں پر فرض ہیں اور اس کے علاوہ نفلی روزوں کی بھی اسلام میں ترغیب دلائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک میں بہت سی وہ عبادات بھی کرتے تھے جو غیر رمضان میں آپ ﷺ کا معمول نہ تھا۔ روزے کے حوالے سے آپ ﷺ کا فرمان ہے:

☆ سحری کھاؤ‘ کیونکہ سحری میں برکت ہے۔

☆ ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزوں میں فرق سحری کھانے کا ہے۔

☆ دین اُس وقت تک غالب رہے گا جب تک لوگ افطار میں تعجیل کریں گے‘ کیونکہ یہود ونصاریٰ تاخیر کرتے ہیں۔

رمضان المبارک میں آپ ﷺ نے اَسفار بھی کیے اور غزوات میں بھی حصّہ لیا۔ آپؐ نے سب سے عظیم اور فیصلہ کن غزوۂ بدر اور غزوۂ فتح مکّہ کا سفر بھی رمضان المبارک ہی میں کیا۔

حج وعمرہ

رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک حج فرمایا اور وہی حجۃ الوداع کہلاتا ہے۔ آپ ﷺ نے بے شمار مؤمنین کے ساتھ حج فرمایا اور آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدِّیق ؓ کی سواری ایک تھی۔ جب آپ ﷺ حرم شریف میں داخل ہوئے تو بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی فرمایا:

''اے اللہ! اپنے اس گھر کی عزّت وشرف‘ تعظیم وتکریم اور رعب وہیبت میں اور اضافہ فرما۔''

آخر کار آپ ﷺ نے عرفہ کے دن میدانِ عرفات کے وسط میں ایک شاندار تاریخی خطبہ دیا‘ جسے خطبہ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس خطبہ کا لُبِّ لُباب یہ ہے:

☆ شرک اور جہالت کی بنیادیں ختم کر دی گئیں۔

☆ ناحق خون کرنا‘ مال غصب کرنا‘ آبرو ریزی کو حرام قرار دے دیا گیا۔

☆ جاہلیت کی ممکنہ رسومات اور مروّجہ دستور کو آپ ﷺ نے اپنے قدموں تلے روند دیا۔
☆ سود ختم کر دیا گیا اور اس کو باطل قرار دے دیا گیا۔
☆ خواتین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین اور ترغیب دلائی گئی۔
☆ خواتین کو پہلی بار ان کے جائز حقوق عطا کیے گئے‘ جن میں خوراک‘ لباس‘ نان نفقہ کے حقوق شامل ہیں۔
☆ آپ ﷺ نے اُمّت کو گمراہی سے بچنے کا بہترین نسخہ بتادیا کہ مؤمنین کتاب اللہ کے ساتھ جڑے رہیں۔

اذکار

رسول اللہ ﷺ عبودیت‘ توجہ الی اللہ اور ذکرِ الٰہی کا کامل ترین اور افضل ترین نمونہ تھے۔ آپ ﷺ ہمہ وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول و مصروف رہتے اور ہر حال میں آپ ﷺ کو خُدا کی یاد رہتی۔ آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کو خاص موقعوں اور خاص وقتوں میں مختلف مفید دعائیں سکھاتے رہتے تھے جنھیں مسنون دعائیں کہتے ہیں۔ ان دعاؤں میں زندگی کا کوئی پہلو تشنہ کام نہ رہا اور شادی‘ غمی‘ لباس‘ خوراک‘ سواری‘ ملاقات‘ پریشانی‘ بیماری‘ قرض‘ تنگی‘ آفات و بلیات سے حفاظت سے لے کر سونے جاگنے تک کی دُعائیں آپ ﷺ نے اپنی اُمت کو عطا فرمائیں۔

جہاد

رسول اللہ ﷺ کی دعوت اللہ تعالیٰ کی صحیح اور کامل و مکمل معرفت اور محض قلبی‘ مالی اور بدنی عبادات سے ہی وابستہ نہیں تھی‘ بلکہ ان سب امور کے ساتھ جہاد و قتال بھی آپ ﷺ کے دین کی خصوصیات‘ دعوت کے ارکان اور پسندیدہ اعمال میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال:۳۹)

’’اور ان (کُفار) سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا زور اور دبدبہ) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔‘‘

علامہ ابن قیمؒ ’’زاد المعاد‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی راہ میں اپنے قلب و جگر‘ دعوت و تبلیغ اور سیف و سنان سے

جہاد کا حق ادا کر دکھایا۔ آپ ﷺ کے تمام اوقات قلبی‘ لسانی اور جسمانی جہاد کے لیے وقف تھے۔ اسی لیے دنیا میں آپ ﷺ سب سے بلند و بالاتر اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ مقرب و محبوب تھے۔‘‘

جہاد کی اقسام

جہاد کی چار اقسام ہیں:

(۱) نفس سے جہاد
(۲) شیطان سے جہاد
(۳) کُفّار سے جہاد (قتال)
(۴) منافقین سے جہاد

رسول اللہ ﷺ نے جہاد و قتال کے بارے میں فرمایا ہے:

☆ اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام کو نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔
☆ اسلام کی چوٹی جہاد ہے۔

آپ ﷺ نے اپنے صحابہ ؓ کو جہاد کے آداب بھی سکھائے۔ مثلاً:

☆ سب سے پہلے مقابل کو قبولِ اسلام کی دعوت دی جائے۔
☆ جو لوگ شرائط اسلامی پر راضی ہو جائیں ان سے جنگ نہ کی جائے۔
☆ خواتین اور بچوں پر ہاتھ نہ اُٹھایا جائے۔
☆ کسی کی لاش کا مُثلہ نہ کیا جائے۔
☆ مالِ غنیمت میں خیانت نہ کی جائے۔

تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس

اللہ تعالیٰ نے بعثتِ محمدی ﷺ کے بنیادی مقاصد اور عظیم و اساسی فوائد قرآن پاک میں کئی مقامات پر ذکر فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾﴾ (آل عمران)

’’اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں ایک پیغمبر انہی میں سے بھیجا جو ان کو اُس (سبحانہٗ) کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتا ہے‘ ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔ اور پہلے تو یہ لوگ یقیناً صریح گمراہی میں تھے۔‘‘

دعوتِ نبوی اور بعثتِ محمدی ﷺ کے دائرۂ مقاصد میں تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس نہایت ہی اہم مقام رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم کا اسلوب بتاتا ہے کہ حکمت سے مراد بلند اخلاق اور اسلامی آداب ہی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب نبی مکرم ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: ’’کان خُلقُه القرآن‘‘ یعنی آپ ﷺ کے اخلاق معلوم کرنا ہوں تو قرآن دیکھو!

یہ حکمت اور تزکیۂ نفس رسول اللہ ﷺ کی صحبتِ بابرکت سے آپ ﷺ کے اصحابؓ تک منتقل ہوا اور اس طرح نسل در نسل چلتے ہوئے سعید روحوں کا ایک اجتماع تیار ہوگیا‘ جس سے ایک ایسی نسل پروان چڑھی جو اخلاقِ رذیلہ سے کوسوں دور اور اعلیٰ روحانی واخلاقی اطوار سے مرصّع تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوگیا تو قرآن مجید‘ حدیث شریف اور سیرتِ طیّبہ اس خلا کو پُر کرتے رہے۔ یہ گویا تعلیم کتاب وحکمت‘ قلوب کے امراض‘ نفس کے شرور اور شیطان کے مکائد کے علاج کا ایک دائمی اور عالمگیر مطب اور دار الشفاء تھا۔

آپ ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فراخ دل‘ نرم طبیعت اور خاندانی لحاظ سے سب سے زیادہ محترم تھے۔ اپنے صحابہ کرامؓ سے الگ تھلگ نہ رہتے تھے‘ بلکہ ان سے پورا میل جول رکھتے تھے۔ ان سے باتیں کرتے‘ ان کے بچّوں کے ساتھ خوش طبعی اور خوش مذاقی کے ساتھ پیش آتے۔ مسلمانوں پر آپ ﷺ بے حد شفیق اور مہربان تھے اور ان کے احوال کی بہت رعایت فرماتے تھے۔ آپ ﷺ ہر معاملے میں اعتدال پسند اور افراط وتفریط سے پاک تھے۔ آپ ﷺ بچّوں پر بہت رحم اور شفقت فرماتے تھے اور اپنے اہل وعیال کا حد درجہ خیال فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کمزور و بے جان جانوروں پر بھی شفقت فرماتے۔ غلاموں‘ کنیزوں‘ ملازمین اور ناداروں پر خاص رحمت فرماتے اور ان سے حسنِ سلوک کی ہدایت فرماتے۔

محبّت کا آئین سب سے نرالا ہے۔ مُحبِّ صادق میں اپنے محبوب کے عادات وخصائل اور اس کی پسند و ناپسند اور اطوار و عادات‘ نشست و برخاست کو اپنانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچا مومن حضور ﷺ کی محبّت میں سرشار ہو کر آپ ﷺ کی عادات واطوار اور آپ ﷺ

کے شمائل کو اپنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ آپ ﷺ کے عُشاق بھی آپ ﷺ کی سیرت پر عمل کر کے دنیا کے سامنے مثالیں پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے آپ کو تین باتوں سے بالکل بچا کر رکھا تھا:

(۱) نہ کسی کی بُرائی کرتے تھے۔

(۲) نہ کسی پر عیب لگاتے تھے۔

(۳) نہ کسی کی کمزوریوں اور پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے تھے۔

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے اَخلاق ومحاسن کا احاطہ کرنا ایک بے حد مشکل کام ہے‘ جس پر علماء اور محقّقین ہزاروں لاکھوں کتابیں تحریر کر چکے ہیں‘ اور تا حشر آپ ﷺ کی حیاتِ مبارک کے مختلف گوشے منظر عام پر آتے رہیں گے۔ آپ ﷺ کا ذکر خیر کرنے والا آخر کار یہی کہتا ہے کہ نہ آپ ﷺ سے قبل میں نے آپ ﷺ جیسا کوئی شخص دیکھا نہ آپ ﷺ کے بعد۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ!!

خوشگوار زندگی کے سنہری اصول

تالیف: سماحة الشيخ العلامة عبدالرحمٰن ناصر السعدی

ترجمانی: ابوعبدالرحمٰن شبیر احمد نورانی

مقدمہ بقلم مؤلف

الحمد لله الذی له الحمد كله' واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له'
واشهد ان محمد عبده ورسوله ' صلی الله عليه وعلیٰ آله واصحابه وسلم

اما بعد: یقیناً دل کی راحت وخوشی پانا' غموں اور فکروں کو دور کرنا' ہر انسان کی خواہش ہوا کرتی ہے' اسی کے نتیجے میں اچھی زندگی ملتی ہے اور خوشی وسرور مکمل ہوتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ اسباب تو دینی ہوتے ہیں اور کچھ اسباب فطری ہوتے ہیں' نیز عملی اسباب بھی ہوتے ہیں' اور یہ تمام اسباب صرف اہلِ ایمان کے لیے ہی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ تاہم دوسروں کے لیے اگر کسی وجہ سے اور ان کے عظیم عقل مندوں کی کوشش سے کچھ فوائد حاصل بھی ہو جائیں تو بہت ساری وجوہات سے ملنے والے فائدے چھوٹ بھی جاتے ہیں' جو زیادہ فائدہ مند' دیرپا اور اچھے حالات ونتائج والے ہوتے ہیں۔ تاہم مَیں اپنے اس کتابچے میں اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچانے والے اُن اسباب کا ذکر کروں گا جس تک پہنچنے کی ہر کوئی کوشش کرتا ہے۔

چنانچہ کچھ لوگوں نے تو بہت سارے اسباب کو اپنایا ہے' تو وہ بہت ہی مبارک زندگی جیے اور خوشگوار زندگی گزاری' جب کہ کچھ لوگ ان اسباب کو اختیار کرنے میں ناکام رہے' تو بدبختی والی زندگی بسر کی اور محرومیوں بھری زندگی جیے۔ اور کچھ لوگ ان کے درمیان درمیان رہے' جس قدر ان کو توفیق میسر آئی۔ اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات توفیق بخشنے والی ہے' اور ہر خیر کو پانے اور شر کو دور کرنے میں مدد دینے والی وہی ذات ہے۔

(۱) خوشگوار زندگی کا سب سے بڑا سبب اور جڑ بنیاد یہی ہے' اور وہ ہے ایمان اور عملِ صالح۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٧﴾﴾ (النحل)

”جو شخص نیک عمل کرے' مرد ہو یا عورت' لیکن باایمان ہو' تو ہم اُسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے' اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انہیں ضرور ضرور دیں گے۔“

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بتادیا ہے اور وعدہ بھی کیا ہے کہ جس نے ایمان اور عملِ صالح کو اکٹھا کر لیا' اُسے اسی دنیا میں عمدہ زندگی عطا فرمائے گا اور بہت اچھا بدلہ دے گا' اِس دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔

اور اس کا سبب بالکل واضح ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان لاتے ہیں' جس کے نتیجے میں عملِ صالح پیدا ہوتا ہے' جو انسان کے دل' اخلاق اور دنیا و آخرت کی اصلاح کر دیتا ہے' ان لوگوں کے پاس ایسے اصول وضابطے ہوتے ہیں جن کے ذریعے خوشی ومسرت دینے والے تمام اسباب کا استقبال کرتے ہیں۔ نیز پریشانی' غم اور مشکلات کا بھی خوشدلی سے استقبال کرتے ہیں' محبت ومسرّت کو قبول کرتے ہیں' اِس پر شکر بجالاتے ہیں اور اُنہیں ایسی جگہوں پر خرچ کرتے ہیں جس سے اُنہیں فائدہ ہو۔ جب یہ نعمتیں اُن کی صحیح جگہ پر خرچ ہوتی ہیں تو اُن کے دل میں خوشی پیدا ہوتی ہے' اور اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ نعمتیں ہمیشہ رہیں اور اُن کی برکت اُنہیں حاصل رہے۔ شکر گزاروں والے ثواب کے بھی یہ امیدوار ہوتے ہیں' کچھ اور بڑے نتائج ہوتے ہیں جو اِن راہوں کے فائدوں اور برکتوں سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔

اور یہ لوگ مشکلات' نقصانات' غموں اور پریشانیوں کا جس قدر ہو سکتا ہو مقابلے کے ذریعے استقبال کرتے ہیں' اور جس قدر ان کو ہلکا سمجھا جا سکتا ہو انہیں ہلکا بھی سمجھتے ہیں' اور جہاں ان کا بس نہیں چلتا وہاں صبرِ جمیل سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح تکلیفوں کے نتائج کا نفع بخش مقابلہ کرتے ہیں' اِن سے تجربات اور طاقت حاصل کرتے ہیں' صبر سے کام لیتے ہیں' اور ایسے عظیم اجر وثواب کے طلب گار بن جاتے ہیں جس کے سامنے مشکلات کمزور پڑ جاتی ہیں' اور اُس

کی جگہ خوشیاں‘ اچھی امیدیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل وثواب کی تمنا آجاتی ہے۔ یہی بات رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ارشاد فرمائی ہے‘ فرمایا:

((عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ: إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ)) (صحیح مسلم: ۲۹۹۹)

’’مؤمن کا معاملہ بھی خوب ہے‘ اس کے ہر کام میں خیر ہی خیر ہے۔ اگر اُسے خوشی ملے تو شکر بجالاتا ہے‘ یہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اُسے تکلیف ملے تو صبر کرتا ہے‘ یہ بھی اُس کے لیے خیر ہے‘ اور یہ مقام مؤمن کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے نہیں ہے۔‘‘

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن کے فائدے‘ خیر اور اس کے کاموں کے نتائج بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں‘ خواہ اُسے کوئی خوشی ملے یا اُس پر پریشانی آئے۔

اسی لیے آپ دو آدمیوں کی مثال اپنے سامنے رکھیں‘ جنہیں چاہے خیر ملے یا تکلیف آئے‘ یہ دونوں حالات کا استقبال دو انتہائی مختلف طریقوں سے کرتے ہیں اور یہ فرق اُن کے ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ایک آدمی جس میں ایمان واعمالِ صالحہ پائے جاتے ہوں‘ تو جیسا ہم نے بیان کیا‘ وہ خیر و شر کا استقبال صبر وشکر اور جو کچھ اُن کے تابع ہوتا ہے‘ کے ساتھ کرے گا۔ نتیجۃً اُسے خوشی اور مسرّت ملے گی تو غم‘ پریشانی‘ تناؤ‘ دل کی گھٹن‘ زندگی کی بدبختی سب ختم ہو جاتے ہیں‘ اور اِس دنیا میں بھی اُس کی زندگی شاداں وفرحاں گزرتی ہے۔

اور ایک دوسرے آدمی کا کردار ہے جو محبوب چیزوں کا استقبال انتہائی برے طریقے سے‘ تکبر سے اور سرکشی سے کرتا ہے‘ نتیجۃً اُس کے اخلاق صحیح راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ وہ نعمتوں کا استقبال اس طرح کرتا ہے جیسے کہ ڈھور ڈنگر کرتے ہیں‘ یعنی انتہائی لالچ اور بے صبری کے ساتھ۔ اِن ساری حرکتوں کے باوجود اُسے کسی طرح چین نہیں ملتا‘ بلکہ وہ کئی طرف بکھرا ہوا ہوتا ہے۔ محبوب چیزوں کے چھن جانے کے خوف کی وجہ سے اُسے بے چینی ہوتی ہے‘ اور عام طور پر جو مخالفت ومقابلہ بازی ہوتی ہے وہ اس بے چینی کا سبب ہوتی ہے۔ دوسری طرف جو انسانی خواہشات ہیں وہ کسی ایک جگہ پر جا کر نہیں رکتیں‘ بلکہ ہمیشہ نئے نئے شوقوں کی طرف لپکتی ہیں‘ جو کبھی مل جاتے ہیں اور کبھی نہیں مل پاتے۔ بالفرض اگر یہ مرغوب چیزیں مل بھی جائیں تو مذکورہ بالا

اسباب کی وجہ سے بے چینی و بے کلی پھر بھی رہتی ہے۔ اور ایسا انسان مشکلات کا بے چینی‘ بے صبری‘ خوف اور جھنجلاہٹ سے استقبال کرتا ہے۔ پھر زندگی کی مشکلات اور ذہنی واعصابی بیماریوں کے بارے میں مت پوچھو۔ اور اسے ایسا خوف لاحق ہوتا ہے جو حالات کو بدترین نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔ اور انتہائی پریشان کن صورتِ حال بنتی ہے‘ اس لیے کہ نہ تو اسے ثواب کی امید ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پاس ایسا صبر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُسے تسلی ہو اور اس پر مشکلات آسان ہو جائیں۔

اور یہ سب باتیں تجربے میں آئی ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی مثال ایسی ہے کہ جب اس پر تم غور کرو اور اسے لوگوں کے حالات پر منطبق کر کے دیکھو تو تمہیں عظیم فرق نظر آئے گا‘ اُس مؤمن بندے کے درمیان جو اپنے ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتا ہے اور اُس آدمی کے درمیان جو ایسا نہیں ہے۔ مؤمن بندے کا دین اُسے اللہ کے دیئے ہوئے رزق اور بندوں کو کئی طرح کے فضل وکرم سے جو نوازا ہے‘ اس پر قناعت کرنے کا زبردست سبق دے گا۔

ادھر مؤمن کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ جب اُسے کوئی بیماری یا محتاجی آجائے‘ یا اِس جیسی کوئی اور مشکل آجائے‘ جو ہر انسان کو آتی رہتی ہے‘ تو وہ اپنے ایمان کی طاقت سے اور جو اس کے پاس قناعت اور اللہ کی تقسیم پر رضا ہے اس کی طاقت سے پُرسکون ہوگا۔ جس کام پر وہ قادر ہی نہیں ہے‘ اُس کا دل بھی اس کا مطالبہ نہیں کرے گا‘ (دنیاوی معاملات میں) وہ ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھے گا اور اپنے سے زیادہ وسائل رکھنے والے کی طرف نہیں دیکھے گا۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے پاس زندگی کی ساری ضروریات کو پا کر اُس کی خوشی اور سرور میں اضافہ ہو جائے‘ بشرطیکہ اُسے قناعت نہ ملی ہو۔ اسی طرح تم ایسے شخص کا حال دیکھو جو ایمان کے تقاضے کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ جب اُسے کوئی محتاجی آجائے یا اُس کے دنیوی مقاصد حاصل نہ ہوں وہ انتہائی بربادی اور بدبختی کا شکار ہو جائے گا۔

دوسری مثال: جب خوف کے اسباب پیدا ہو جائیں اور انسان کو پریشانیاں آگھیریں‘ تو پختہ ایمان والے انسان کا دل بالکل ثابت اور مطمئن ہوگا‘ وہ دل جمعی سے اپنے کاموں میں مشغول ہوگا‘ اور جو معاملہ اُسے درپیش ہو گیا ہے اُسے لے کر چلتا رہے گا۔ ذکر وفکر اور قول وعمل کے ذریعے جو کچھ اس سے بن پڑے گا اس کے ساتھ اس پریشانی کا مقابلہ کرتا رہے گا۔ اُس

نے اِس آنے والی پریشانی کو اپنے دل میں جگہ دے دی ہے' اور ایسے حالات انسان کو آرام پہنچاتے ہیں اور اس کے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔

اور تم یہ بھی دیکھو گے کہ جو شخص ایمان سے خالی ہوگا اس کا حال اس شخص کے بالکل الٹ ہوگا۔ جب اُس کے پاس ڈرانے والی باتیں آئیں تو اُس کا دل کانپ جاتا ہے' اُس کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں' اُس کی سوچ بکھر جاتی ہے' اُس کے اندر ڈر اور خوف بیٹھ جاتا ہے' خارجی خوف کے ساتھ ساتھ اندرونی پریشانی بھی مل جاتی ہے' جس کی حقیقت بیان کرنی ممکن نہیں ہوتی ۔ اس قسم کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر انہیں ایسے فطری اسباب نہ ملیں جو کہ بڑی محنت و ریاضت کے محتاج ہوتے ہیں تو ان کی قوتیں بالکل ختم ہو جائیں' اُن کے اعصاب جواب دے جائیں' اس لیے کہ ان کے پاس ایسا ایمان نہیں ہوتا جو پریشانیوں اور غموں میں صبر دیتا ہو۔

بندہ چاہے نیک ہو یا بدکار' مؤمن ہو یا کافر' محنت سے کمائی ہوئی بہادری میں ایک جیسے ہوتے ہیں' اور یہی بہادری خوف اور پریشانی کو کم کرتی ہے ۔لیکن مؤمن کو ایک امتیازی شان حاصل ہے کہ اپنے ایمان' صبر' اللہ تعالیٰ پر توکّل' اسی پر بھروسے اور اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ثواب کی نیت کی وجہ سے اس کی بہادری بڑھ جاتی ہے' خوف کا غلبہ کم ہو جاتا ہے' اس طرح مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنۡ تَكُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ يَاۡلَمُوۡنَ كَمَا تَاۡلَمُوۡنَ ۚ وَتَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرۡجُوۡنَ ؕ﴾ (النساء:۱۰۴)

''اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اُٹھا رہے ہیں' اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔''

اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ملتی ہے اور خاص قسم کا تعاون ہوتا ہے' جو کہ خوف کو اُڑا کے رکھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الانفال)

''صبر سے کام لو' یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

(۲) جو اسباب پریشانی' غم اور بے قراری کو ختم کر سکتے ہیں وہ ہیں مخلوقِ خدا کے ساتھ قول و فعل اور دوسری نیکیوں کے ذریعے اچھا برتاؤ کرنا۔ اور یہ سب کام بہتر ہیں اور بھلائی کے ہیں' اور انہی

کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہر نیک و بد سے حالات کے اعتبار سے غموں اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے۔ البتہ اہلِ ایمان کا اس میں بہت بڑا حصّہ اور نصیبہ ہوا کرتا ہے' اور مؤمن کا یہ بھی امتیازی مقام ہوتا ہے کہ وہ یہ کام اخلاص اور ثواب کی نیت سے کرتا ہے۔ چونکہ مؤمن بھلائی ہی چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے نیکی کرنا آسان کر دیتا ہے۔ اُس کے اخلاص اور نیکی کمانے کی نیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس سے مشکلات دور کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا خَيۡرَ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنۡ نَّجۡوٰىهُمۡ اِلَّا مَنۡ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوۡ مَعۡرُوۡفٍ اَوۡ اِصۡلَاحٍ ۢ بَيۡنَ النَّاسِ ؕ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ فَسَوۡفَ نُـؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ (النساء)

''لوگوں کی سرگوشیوں میں اکثر کوئی خیر نہیں ہوتی' ہاں ! البتہ بھلائی اس مشورے میں ہے جو خیرات کا ہو' یا نیک بات کا ہو' یا لوگوں میں صلح کرانے کا حکم کرے۔ اور جو شخص صرف اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے ارادے سے یہ کام کرے' اسے ہم یقیناً بہت بڑا ثواب دیں گے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ جو کوئی بھی یہ کام کرے یہ سارے کام بہترین ہیں۔ بھلائی بھلائی ہی لے کر آتی ہے اور برائی کو دور کرتی ہے' اور یہ کہ ثواب کی نیت سے عمل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بہت بڑے اجر سے نوازتا ہے' اور اجر عظیم کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس سے پریشانی' غم اور اِس طرح کی دوسری مشکلات کو دور کر دیتا ہے۔

(۳) اعصابی تناؤ اور تکلیف دہ حالات میں دل کی پریشانی کو کن اسباب میں مصروف ہو کر دور کیا جا سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ کسی فائدہ مند کام یا کسی علمی کام میں اپنے آپ کو مصروف کر لیا جائے۔ اس قسم کی مصروفیت پریشانی کو دل سے دور کر دے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی مصروفیت اختیار کرنے سے انسان اُن اسباب کو ہی بھول جائے جن کی وجہ سے غم اور پریشانیاں آئی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کا دل باغ و بہار ہو جائے گا' اس کی نشاط و چستی بڑھ جائے گی' اور یہ سبب مؤمن اور غیر مؤمن میں مشترک ہے۔ لیکن مؤمن کی امتیازی شان اُس کا ایمان و اخلاص ہے' اور علم کے سیکھنے سکھانے میں جو وقت خرچ ہوگا' اس میں اجر کی نیت کر لے گا' اور جس جس بھلائی کو وہ جانتا ہے اس پر عمل کرے گا۔ اگر عبادت والا کام ہوگا تو وہ اُس کی عبادت بن جائے گی' اور اگر

دُنیوی کام یا دُنیوی عادت ہوگی تو بھی اُس کی نیت نیک ہی ہوگی۔ اس کا ارادہ ہوگا کہ اس کام کو وہ اللہ کی اطاعت کا ذریعہ بنائے۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پریشانیاں‘ غم اور فکر مندیاں اِس مؤمن سے دُور ہو جائیں گی۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کو اُلجھنوں اور پریشانیوں نے آ دبوچا تو وہ کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ تو ایسے شخص کا کامیاب علاج یہ ہے کہ ان اسباب کو بھول جائے جن کی وجہ سے پریشانیاں اور مشکلات آئیں‘ اور اہم ترین کاموں میں مصروف ہو جائے۔ اور مناسب ترین بات یہ ہے کہ ایسے کام میں مصروف ہوا جائے جس سے انسان مانوس ہو اور اسے دل کی خوشی سے کرے۔ اس طرح یہ فائدہ مند مقصد حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔ واللہ اعلم!

(۴) جو چیز غم اور پریشانی کو دور کر سکتی ہے وہ یہ کہ ساری سوچ کو آج کے دن کے عمل پر مرکوز کر دیا جائے۔ مستقبل میں پیش آنے والے کاموں کے بارے میں قطعاً نہ سوچا جائے‘ اور نہ ہی ماضی کے حالات کے غموں کو اپنے اوپر سوار کر لیا جائے۔ اسی لیے نبی مکرم ﷺ نے پچھتاوے اور غموں سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ ’’حُزن‘‘ ماضی کے ان کاموں پر کیا جاتا ہے جن کو نہ واپس لایا جا سکتا ہو اور نہ ہی اُن کا مداوا ہو سکتا ہو۔ اور ’’ھَمّ‘‘ مستقبل کے بارے میں خوف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ (اس اصول کو اپنانے کے بعد) بندہ اپنے موجودہ دن کے بارے میں سوچتا ہے‘ اپنی ساری محنت و کاوش کو موجودہ دن اور حاضر وقت پر متوجہ رکھتا ہے۔ پھر اگر وہ دل کو اسی پر جمالے تو لازماً اس کے سارے کام مکمل ہو جائیں گے اور بندہ غموں اور پریشانیوں سے محفوظ رہے گا۔ اور نبی مکرم ﷺ جب کوئی دعا کرتے یا اُمت کو دعا کی تعلیم دیتے تو آپ ﷺ دعا اور اللہ کے فضل کے ساتھ ساتھ محنت و جستجو کی طرف بھی راہنمائی فرماتے‘ تاکہ بندہ جس چیز کی دعا کر رہا ہے وہ اسے حاصل ہو جائے‘ اور اُس چیز سے بچ کے رہنے کی راہنمائی فرماتے جس کو دور کرنے کی وہ دعا کر رہا ہوتا ہے‘ اس لیے کہ دعا عمل کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ بندہ ہر اُس کام میں محنت کرتا ہے جو اُسے دین و دنیا میں فائدہ دے‘ اور اپنے رب سے مقصد میں کامیاب ہونے کی دعا کرتا ہے اور اس کی مدد چاہتا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُکَ، وَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ وَلَا تَعْجَزْ، وَإِنْ أَصَابَکَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ کَانَ کَذَا وَکَذَا وَلٰکِنْ قُلْ: قَدَرُ اللّٰہِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ)) (صحیح مسلم:۲۶۶۴)

’’جو چیز تمہیں نفع دے اس پر خوب محنت کرو اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور دل توڑ کر مت بیٹھ جاؤ۔ اور یہ مت کہو کہ اگر میں یوں کر لیتا تو یوں ہو جاتا‘ البتہ یہ کہو یہ اللہ کی تقدیر تھی اور اس نے جو چاہا کیا‘ اس لیے کہ ’یہ‘ چونکہ چنانچہ‘ شیطان کے لیے راستہ کھولتا ہے۔‘‘

اس حدیث میں رسولِ مکرم ﷺ نے ہر حال میں نفع بخش کاموں پر بھرپور توجہ دینے‘ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور بے بسی سے دور رہنے کو جمع کر دیا ہے‘ اور یہی نقصان دہ سستی ہوتی ہے۔ اور آپ ﷺ نے جمع کر دیا ہے ماضی میں جو کام ہو چکے ہیں ان کے سامنے ڈھیر ہونے کو اور اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کو دیکھنے کو۔

آپ ﷺ نے معاملات کے دو حصے کر دیے ہیں‘ ایک حصّہ وہ ہے جس کو بندہ محنت سے حاصل کر سکتا ہے یا ممکنہ حد تک کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتا ہے‘ یا مشکل کو دور کر سکتا ہے یا کسی حد تک اُسے کم کر سکتا ہے۔ ان کاموں میں بندہ اپنی کوشش کرے اور اپنے رب سے مدد مانگے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس میں بندہ کچھ نہیں کر سکتا‘ چنانچہ اس میں بندے کو مطمئن رہنا چاہیے‘ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہے اور اپنے معاملات کو اللہ کے سپرد کر دے۔ بلاشبہ اس اصول پر چلنے سے اُسے خوشی حاصل ہوگی‘ غم اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

(۵) شرحِ صدر اور اطمینان حاصل کرنے کا سب سے بڑا سبب‘ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ہے۔ شرحِ صدر‘ اطمینانِ قلب‘ نیز غم اور پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے اس کے حیران کن اثرات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾﴾ (الرعد)

’’خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔‘‘

چنانچہ اطمینان و سکون حاصل کرنے کے لیے اللہ کے ذکر میں بڑی تاثیر ہے‘ کیونکہ وہ اسی کام کے لیے ہے‘ اور اس لیے بھی کہ بندہ اس کے ذریعے اجر و ثواب کا طلب گار رہتا ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ کی ظاہری و باطنی نعمتوں کا اظہار کرنا‘ کیونکہ ان نعمتوں کی پہچان اور تذکرے سے اللہ تعالیٰ غموں اور پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو شکر ادا کرنے کی ترغیب دیتا ہے‘ جو کہ ایمان کا سب سے اونچا مقام ہے‘ بھلے بندہ محتاج‘ بیماری یا دوسری مشکلات میں پھنسا ہوا ہو‘ کیونکہ اگر بندہ اُن تمام نعمتوں کو شمار کرنے لگے جن سے وہ فیضیاب ہو رہا ہے تو وہ نہ

ان نعمتوں کو گن سکتا ہے اور نہ ہی شمار کر سکتا ہے۔ اور پھر ان تکلیفوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرے جو اُسے پہنچی ہیں تو نعمتوں کے مقابلے میں پریشانیوں کی کوئی نسبت ہوتی ہی نہیں۔ بلکہ مشکلات ومصائب کا تو یہ مقام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ان کے ذریعے آزماتا ہے‘ اور بندہ بھی صبر کا مظاہرہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے سامنے جھک جاتا ہے اور راضی رہتا ہے‘ تو اُنہیں برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے‘ اور ان مشکلات پر آنے والی پریشانی کم ہو جاتی ہے‘ اور بندہ اِن پر اجر وثواب کا امیدوار بن جاتا ہے‘ کیونکہ تقدیر پر صبر ورضا کا مظاہرہ کر کے وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالاتا ہے۔ اس طرح جو چیزیں بظاہر کڑوی تھیں میٹھی ہو جاتی ہیں‘ نتیجۃً اجر کی مٹھاس صبر کی کڑواہٹ کو بھلا دیتی ہے۔

(۷) اس مقام پر سب سے زیادہ فائدہ مند وہ کام ہے جس کے بارے میں صحیح حدیث میں نبی مکرم ﷺ نے راہنمائی فرمائی ہے کہ:

((اُنْظُرُوا إِلٰى مَنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ)) (صحیح مسلم: ۲۹۶۳)

’’(دنیا کے اعتبار سے) اُس شخص کی طرف دیکھو جو تم سے نیچے (کمزور حالات میں) ہے‘ اور اُس شخص کی طرف نہ دیکھو جو تم سے اوپر (بہتر حالات میں) ہے۔ یہ طریقہ بہت مناسب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی قدر کرو گے۔‘‘

کیونکہ جب بندہ اس بہترین نصیحت کو اپنا نصب العین بنالے گا تو وہ اپنے آپ کو دیکھے گا کہ وہ جیسے بھی حالات میں ہے‘ پھر بھی بہت سارے لوگوں سے بہتر ہے‘ صحت وعافیت کا معاملہ ہو یا اس سے ملتے جلتے حالات ہوں‘ اور یہی بات رزق اور اس سے متعلقہ حالات کی ہے۔ اس طرح اُس کے سارے غم‘ پریشانیاں اور الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ اسی طرح جب کمزور حالات میں لوگوں کو دیکھ کر اپنی نعمتوں کو دیکھے گا تو اُس کی خوشی ومسرّت میں اضافہ ہو جائے گا۔ دین ودنیا کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ظاہری وباطنی نعمتوں پر بندہ جس قدر زیادہ سوچے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ اللہ نے اسے بہت بڑے خیر سے نواز رکھا ہے‘ اور اُسے بہت ساری پریشانیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ اس اصول کو اپنانے سے بہت سارے غم اور فکریں دور ہو جائیں گی‘ اور بہت زیادہ خوشی وسرور حاصل ہوگا۔

(۸) جو اسباب خوشی اور سرور کو لانے والے ہیں اور غم اور پریشانی کو دور کرنے والے ہیں: تو جو

اسباب پریشانیاں لانے والے ہیں اُن کو ختم کیا جائے‘ اور جو اسباب خوشی لانے والے ہیں انہیں تلاش کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ماضی میں جو تکلیفیں آچکی ہیں اور انہیں ختم بھی نہیں کیا جاسکتا‘ اُنہیں بھول جایا جائے۔ اور یہ بات بھی جان لیں کہ ان باتوں میں ذہن کو الجھانا بے مقصد اور ختم کرنا ناممکن ہوتا ہے‘ اور یہ حماقت اور پاگل پن بھی ہے۔ چنانچہ اُنہیں اپنے دل سے نکالنے میں بڑی محنت کرنی ہوگی اور آئندہ کے لیے اپنے دل کو محفوظ کرنے کے لیے بھی بڑی محنت کرنی پڑے گی‘ کہ آئندہ یہ تفکرات آپ کے دل پر حملہ نہ کر پائیں۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ فقیری‘ خوف یا دوسری قسم کی پریشانیاں اس کے دماغ پر سوار ہو جائیں گی۔

مستقبل کی زندگی کے حوالے سے جن اندیشوں کے بارے میں انسان سوچتا رہتا ہے‘ اسے یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ مستقبل کے حالات نامعلوم ہیں‘ اس میں خیر بھی ہوسکتی ہے اور شر بھی۔ امیدیں بَر آسکتی ہیں اور پریشانیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور یہ سارے کام اللہ عزیز وحکیم کے ہاتھ میں ہیں۔ بندوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے‘ سوائے اس کے کہ وہ بھلائیاں پانے کی کوشش کرتے رہیں اور نقصان دہ کاموں سے دور رہیں۔ اور بندے کو یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اگر وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے اپنی سوچ کو پریشانیوں سے محفوظ کر لے گا اور اصلاحِ حال کے لیے اپنے رب پر بھروسہ کرے گا اور اس پر مطمئن بھی ہو جائے گا‘ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس کا دل مطمئن ہو جائے گا‘ اُس کے حالات اچھے ہو جائیں گے اور غم وپریشانیاں اُس سے دور ہو جائیں گی۔

(۹) مستقبل میں پیش آنے والے معاملات کے حوالے سے اس دعا کو پڑھنا سب سے زیادہ نفع بخش ہے‘ اور انہی کلمات کے ذریعے نبی مکرم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اَصلِحْ لِی دِینِیَ الَّذِی هُوَ عِصمَةُ اَمرِی‘ وَاَصْلِحْ لِی دُنْیَایَ الَّتِی فِیها مَعَاشِی‘ وَاَصْلِحْ لِی آخِرَتِیَ الَّتِی اِلَیها مَعادی‘ وَاجْعَلِ الْحیاةَ زِیَادةً لِی فِی کُلِّ خَیرٍ‘ وَالمَوتَ رَاحَةً لِی مِنْ کُلِّ شَرٍّ)) (صحیح مسلم: ۲۷۲۰)

’’اے اللہ! میرے دین کی اصلاح فرمادے‘ جو میرے معاملات کی پناہ گاہ ہے‘ اور میری اس دنیا کی بھی اصلاح فرمادے‘ جس میں مجھے زندہ رہنا ہے‘ اور میری آخرت کی بھی اصلاح فرمادے جہاں مجھے واپس جانا ہے‘ اور میری زندگی کو ہر خیر وبھلائی میں

اضافے کا ذریعہ بنادے‘ اور میری موت کو ہر شر سے راحت کا سبب بنادے۔‘‘

اور اسی طرح ان الفاظ کے ساتھ بھی دعا مانگے:

((اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَکَ أَرْجُو فَلَا تَکِلْنِي إِلٰی نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ ، وَأَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ)) (صحیح سند کے ساتھ امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ صحیح سنن ابی داؤد للالبانی: ۴۲۴۶)

’’اے اللہ! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں‘ مجھے لحہ بھر کے لیے بھی مجھ پر نہ چھوڑنا‘ میرے تمام حالات کی اصلاح فرمادے‘ اور تیرے علاوہ میرا کوئی معبود نہیں۔‘‘

جب بندہ عاجزی کے ساتھ اور حاضر دل سے ان الفاظ کے ساتھ دعا کرے گا‘ جس میں اُس کے دِینی و دُنیوی مستقبل کی اصلاح کی التجا ہوگی‘ اُس کی نیت بھی سچی ہو اور جس چیز کو پانا چاہتا ہے‘ اُس کے لیے محنت بھی کرے‘ تو اللہ تعالیٰ اُس کی دعا کو پورا کردیں گے‘ اس کی امید برآئے گی‘ اس کا کام پوری طرح ٹھیک ہوگا۔ اس طرح اس کی پریشانی خوشی و سرور میں بدل جائے گی۔

(۱۰) جب بندے پر مشکلات آپڑیں تو گھبراہٹ اور پریشانی کو ختم کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر نسخہ یہ ہے کہ ان پریشانیوں کو کم کرنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا وہ یہ فرض کرلے کہ زیادہ سے زیادہ پریشانیاں کہاں تک آسکتی ہیں‘ پھر اپنے دل کو ان پریشانیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار کرلے‘ تو ممکنہ حد تک جتنا ہوسکتا ہو‘ اِن پریشانیوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح اپنے آپ کو غموں کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرے۔ اس مفید کوشش کے نتیجے میں اُس کے غم اور پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔ اور اُس کی جگہ بندے کی کوشش فائدے حاصل کرنے اور بآسانی نقصانات دور کرنے کے لیے ہوگی۔

اسی طرح جب کبھی خوف‘ بیماری‘ محتاجی اور مختلف قسم کی محبوب چیزیں چھن جانے کا خوف پیدا ہو‘ تو سکون کے ساتھ اُن کا سامنا کرے‘ اور اپنے دل کو اس کے لیے تیار رکھے‘ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت حالات کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھے‘ کیونکہ مشکلات کے لیے پیشگی تیاری اُن کو آسان بنادیتی ہے‘ بالخصوص جب انسان کا دل حسبِ استطاعت مقابلے کے لیے تیار ہو۔ اس طرح اُس پر دو ذمہ داریاں اکٹھی ہوجاتی ہیں‘ دل کو مشکلات برداشت کرنے کے لیے تیار کرنا اور اس طرح کی فائدہ مند کوشش کرنا جو انسان کو مشکلات سے غافل کردے۔ چنانچہ وہ مسلسل اپنے آپ کو مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتا رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُسے

اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل اور بہترین بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اور اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ خوشی اور انشراحِ صدر حاصل کرنے کے لیے ان کوششوں کے عظیم فائدے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بندے کو یقین ہونا چاہیے کہ ان مشکلات پر اُسے دنیا و آخرت میں ثواب ملنے والا ہے۔ یہ باتیں مشاہدے اور تجربے میں ہیں اور اس قسم کے بہت زیادہ واقعات بھی موجود ہیں۔

(۱۱) دل کے جذباتی امراض‘ بلکہ جسمانی امراض کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ دل کو مضبوط کیا جائے اور ایسے خیالات اور وہموں کی وجہ سے غصے اور جذبات میں نہ آیا جائے جن کی وجہ سے برے خیالات جنم لیتے ہیں‘ اس لیے کہ جب بندہ خیالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کا دل خارجی اثرات کو قبول کرلیتا ہے‘ جیسے کہ بیماریوں کا خوف‘ تکلیف دہ اسباب کی وجہ سے غصے اور پریشانی کا شکار ہوجانا‘ ناپسندیدہ حالات کے آنے اور محبوب چیزوں کے چلے جانے کی توقع کرنا‘ ایسی صورتِ حال انسان کو پریشانیوں‘ غموں اور قلبی و جسمانی بیماریوں میں مبتلا کردیتی ہے اور اعصابی دباؤ کا شکار کردیتی ہے‘ جس کے بہت برے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے نقصانات کا لوگوں نے بہت زیادہ مشاہدہ کیا ہے۔

(۱۲) جب دل اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرلیتا ہے اور اس پر توکّل کرنے لگتا ہے‘ اور توہمات کے سامنے ڈھیر نہیں ہوتا اور نہ ہی برے خیالات اس پر غالب آتے ہیں‘ تو وہ اللہ پر بھروسہ کرکے اُس کے فضل کا اُمیدوار بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارے غم اور پریشانیاں اس سے دور ہوجاتی ہیں‘ بہت ساری جسمانی اور دلی بیماریاں بھی خودبخود ٹھیک ہوجاتی ہیں‘ اور دل کو ایسی طاقت اور فرحت و سرور ملتا ہے جس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کتنے ہی ایسے ہسپتال ہیں جو غلط خیالات اور وہموں کے مارے مریضوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ کمزور لوگوں کی بات چھوڑیئے‘ مضبوط دل والوں پر بھی ایسے حالات نے بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کو ایسے حالات نے حماقت و جنون میں مبتلا کیا ہے۔ محفوظ صرف وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی پناہ میں لے لیا ہو‘ اور اسے اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنے کی توفیق دی ہو‘ تاکہ وہ نفع بخش اسباب کو حاصل کرلے‘ جو کہ دل کو تقویت دینے والے اور پریشانی کو دور بھگانے والے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ﴾ (الطّلاق: ۳)

’’اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا‘ اللہ اُسے کافی ہوجائے گا۔‘‘

یعنی دینی و دنیوی معاملات میں اُس کی ساری پریشانیوں کو ختم کرنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والا مضبوط دل ہوتا ہے‘ وہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے‘ اور نہ ہی حادثاتِ زمانہ اُسے پریشان کر سکتے ہیں‘ اِس لیے کہ اُسے معلوم ہے کہ یہ چیزیں دل کی کمزوری‘ سستی اور ڈر کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں‘ جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں‘ اور اُسے یہ بھی خوب علم ہے کہ جو شخص اللہ پر توکّل کرلے اللہ تعالیٰ اُس کی ہر طرح کفالت کرتے ہیں۔ اس طرح اُس کا اللہ پر بھروسہ ہو جاتا ہے اور اُس کے وعدے پر اسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس کے غم اور پریشانیاں دور ہو جاتے ہیں‘ تنگی کی جگہ آسانی لے لیتی ہے‘ غم کی جگہ خوشی آ جاتی ہے اور خوف کی جگہ امن لے لیتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت کے طلبگار ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ایسے توکّل کے نتیجے میں ہمیں دلی طاقت اور ثبات عطا فرمائے‘ جس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہر خیر عطا کرنے اور ہر پریشانی و نقصان کو دور کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

(۱۳) نبی مکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً ، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا خُلُقًا آخَرَ))

(صحیح مسلم: ۱۴۶۹)

’’کوئی مؤمن کسی مؤمن خاتون (بیوی) سے بُغض نہ رکھے‘ اگر اُس کی کوئی عادت خاوند کو پسند نہیں ہے تو کوئی دوسری عادت اُسے پسند آتی ہو گی۔‘‘

دو عظیم فائدے

پہلا فائدہ: بیوی‘ قریبی رشتہ دار‘ ساتھی‘ ملازم اور ہر وہ آدمی جس کے ساتھ تمہارا میل جول کا کوئی تعلق ہو‘ ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہدایت۔ سب سے پہلے اپنے دل کو اس بات کا عادی بنا لو کہ لازمی بات ہے کہ اس کے اندر کوئی کمی کوتاہی یا ایسی بات ہو سکتی ہے جو تمہیں ناپسند ہو گی۔ جب تمہیں کوئی ایسی بات نظر آئے تو اِس کے ساتھ تعلق کی مضبوطی اور محبت کے ساتھ گزارا کرنے میں جو تم پر واجب ہے یا مناسب ہے‘ کو سامنے رکھ کر اس کی کمزوریوں اور اس کی خوبیوں اور عام و خاص فائدوں کے درمیان مقابلہ کرو۔ اس طرح کمزوریوں سے آنکھ پھیر لینے اور خوبیوں کو نگاہ میں رکھنے سے تعلقات اور رشتہ ہمیشہ بنا رہے گا اور مکمل سکون و آرام حاصل ہو گا۔

دوسرا فائدہ: غم اور پریشانی چلی جاتی ہے‘ ہمیشہ دل صاف رہتے ہیں‘ نتیجۃً واجب اور

مستحب حقوق ہمیشہ ادا ہوتے ہیں‘ اور فریقین سکھ اور آرام میں رہتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی ہدایات کی پیروی نہیں کرتا‘ بلکہ اُن کے الٹ چلتا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُسے ہمیشہ ہی پریشانی رہتی ہے اور وہ خوبیوں سے محروم رہتا ہے‘ تو لازمی بات ہے کہ وہ پریشان رہے گا۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ جن رشتوں کے ساتھ اُس کا محبت کا تعلق تھا وہ دھندلا جاتا ہے‘ اور جن حقوق کی حفاظت کرنا فریقین کی ذمہ داری تھی وہ سب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

اور بہت سارے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے حوصلے بڑے بلند ہوتے ہیں‘ وہ اپنے آپ کو مشکلات اور حادثات پر صبر کرنے اور سکون کے لیے تیار رکھتے ہیں‘ لیکن معمولی سی باتوں پر وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر کی چمک دمک کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بڑے بڑے معاملات پر صبر کرنے کا تو عادی بنایا ہوتا ہے‘ البتہ چھوٹے معاملات پر توجہ نہیں دی ہوتی‘ لہٰذا اُن کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے‘ نتیجۃً آرام غارت ہو جاتا ہے۔ سمجھ دار آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس کو چھوٹے بڑے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھے اور اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا رہے‘ اُسے معمولی وقت کے لیے بھی اپنی ذات پر نہ چھوڑے‘ تب جا کر اُس کے لیے چھوٹے معاملات کو سنبھالنا بھی آسان ہو جائے گا‘ جیسے کہ بڑے حادثات کو برداشت کرنا اس کے لیے آسان تھا۔ انجام یہ ہو گا کہ اُس کی روح مطمئن ہو گی‘ اُس کا دل پُرسکون ہو گا اور وہ آرام سے رہے گا۔

(۱۴) ہر عاقل انسان یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ خوش قسمتی والی زندگی ہی صحیح زندگی ہوتی ہے اور یہ بہت مختصر سی ہے‘ اور یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے کہ غموں اور پریشانیوں میں پڑ کر اِسے اور مختصر کر لیا جائے‘ اور یہ حرکت صحیح زندگی کے خلاف ہے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زندگی کی قدر کرنی چاہیے‘ ایسا نہ ہو کہ غم اور پریشانیاں اُس سے زندگی کا مزہ چھین کر لے جائیں۔ نیک اور بد کے درمیان اِس معاملے میں کوئی فرق نہیں ہوتا‘ لیکن مؤمن کو یہ سکون زیادہ ہی مل جاتا ہے اور اس کا نفع مند نصیب اس دنیا میں بھی ہے اور اُس دنیا میں بھی۔

(۱۵) مناسب بات یہ بھی ہے جب انسان کو کوئی پریشانی ہو یا اُسے پریشانی کا خطرہ ہو تو اُسے مقابلہ کرنا چاہیے‘ اُن دینی و دنیوی حاصل شدہ نعمتوں کے درمیان اور اس ملنے والی تکلیف کے درمیان۔ جب مقابلہ کر کے دیکھے گا تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ جن نعمتوں سے وہ فیضیاب ہو رہا

ہے اُن کی مقدار بہت زیادہ ہے اور جو پریشانی آئی ہے اس کی مقدار بالکل معمولی سی ہے۔

نیز وہ ان دو صورتوں کا بھی مقابلہ کر کے دیکھ لے کہ اُسے کتنے نقصان کا اندیشہ ہے اور اِس سے بچنے کی کتنی صورتیں ممکن ہیں' اور وہ اِس کمزور ممکنہ صورت کو بھی نظرانداز نہ کرے جو کہ بہت ساری مضبوط صورتوں پر غالب آ جایا کرتی ہے۔ اِس طریقے سے اُس کی پریشانی اور خوف ختم ہو جائے گا۔ وہ اندازہ لگائے کہ مشکل بڑی سے بڑی کتنی ہو سکتی تھی' پھر اپنے دل کو تیار کرے کہ اگر مشکل ہوئی تو اتنی ہی ہو سکتی ہے' اور جب تک مشکل سامنے نہ آ جائے اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا رہے' اور اگر آ ہی جائے تو اسے دفع کرنے کی یا کم کرنے کی کوشش کرے۔

(۱۶) ایک نفع بخش کام یہ بھی ہے کہ تم یہ جان لو کہ لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی اور خاص طور پر زبانی ایذا رسانی تمہیں کوئی نقصان نہیں دیتی' بلکہ انہیں نقصان پہنچائے گی۔ ہاں صرف اسی صورت میں تمہیں نقصان دے سکتی ہے جب تم خوامخواہ اس پر توجّہ کرنے لگ جاؤ گے اور اسے اپنے اعصاب پر سوار کر لو گے۔ اس شکل میں وہ تمہیں بھی نقصان دے گی' جیسے کہ کہنے والوں کو نقصان دے رہی ہے۔ اور اگر تم اس پر کوئی توجہ ہی نہ دو تو تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں ہوگا۔

(۱۷) یہ بات یاد رکھو کہ تمہاری زندگی تمہاری سوچ کے تابع ہے۔ پھر اگر تمہاری سوچ ایسی ہے جس کا تمہیں دین و دنیا میں فائدہ ہو سکتا ہے تو تمہاری زندگی انتہائی خوش گوار ہوگی' ورنہ نتیجہ الٹ نکلے گا۔

(۱۸) پریشانیوں کو دور بھگانے کا سب سے زیادہ مفید طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دل کو اس پر مطمئن کر لو کہ مجھے صرف اللہ تعالیٰ سے شکر (اعمال کی قبولیت) چاہیے۔ اس سوچ کے ساتھ جب تم کسی کے ساتھ نیکی کرو' چاہے اُس کا تم پر حق تھا یا نہیں تھا' تو یہ یقین کر لو کہ تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جس کے ساتھ تم نے نیکی کی ہے' اُس کی طرف سے شکریے کی پرواہ ہی نہ کرو' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص الخاص بندوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّمَا نُطۡعِمُكُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِيۡدُ مِنۡكُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُكُوۡرًا ۝۹﴾

(الانسان)

''ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے کھلاتے ہیں' نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر گزاری۔''

بیوی' بچوں اور جن کے ساتھ مضبوط تعلق داری ہے' اُن کے حق میں یہ مسئلہ اور بھی اہمیت کا

ہے۔ پھر جب تم نے اپنے دل کو اس بات پر تیار کر لیا کہ اُن سے تکلیف کو دور کرنا ہے تو اُن کو بھی آرام میں رکھو گے اور خود بھی آرام میں رہو گے۔ اور آرام کا تقاضا یہ ہے کہ اچھے کاموں کو منتخب کیا جائے اور اُن پر عمل بھی کیا جائے' جس حد تک تمہارا دل تمہارا ساتھ دے۔ ایسے تکلّف سے بچا جائے جو پریشانی پیدا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ مقامِ فضیلت پانے سے پہلے ہی تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ جائے' اس لیے کہ تم نے ٹیڑھا راستہ اختیار کیا ہے۔ سمجھ داری کی بات یہ ہے کہ پریشان کن راستوں کو چھوڑ کر صاف ستھرے اور آسان راستے کا انتخاب کیا جائے۔ اس طریقے سے لذّتیں خوب سے خوب تر ہو جائیں گی اور پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔

(۱۹) نفع بخش کاموں کو اپنا نصب العین بنا لو اور انہیں حاصل کرنے کے لیے محنت کرو' اور نقصان دہ کاموں کی طرف توجّہ مت دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسے کاموں میں مصروفیت تمہارے لیے غم اور پریشانی لے آئے۔ ضروری آرام کو اپنا ہتھیار بناؤ' اور انتہائی اہم امور پر اپنی توجّہ رکھو۔

(۲۰) ایک مفید کام یہ بھی ہے کہ ابھی کے کام کو ابھی نمٹاؤ اور مستقبل کے لیے فارغ ہو جاؤ۔ اس لیے کہ اگر کام کو اس کے وقت پر نہ کیا جائے تو سابقہ بچے ہوئے کام اور آنے والے کام اکٹھے ہو جائیں گے' اب ان کو نمٹانا بھاری پڑے گا۔ اور اگر ہر کام کو اُس کے وقت پر ہی کر لیا جائے تو مستقبل میں درپیش معاملات کو مضبوط سوچ اور مضبوط طاقت کے ساتھ انجام دے سکو گے۔

(۲۱) مناسب بات یہ ہے کہ مفید کاموں میں سے بھی اہم ترین کام کا انتخاب کریں' اور اس کام کو ترجیح دیں جس کی طرف تمہارا دل مائل ہو اور رغبت زیادہ ہو' کیونکہ اگر تم نے کوئی ایسا کام منتخب کر لیا جس کی طرف تمہاری رغبت و چاہت نہ ہو' تو اکتاہٹ' الجھن اور پریشانی آئے گی۔

فیصلہ صحیح سوچ اور مشورے سے کریں' کیونکہ جو مشورہ کر لے وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوتا' اور جس کام کا پروگرام بن جائے اُس کے بارے میں اچھی طرح سوچ بچار کرنی چاہیے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہی صحیح ہے اور پختہ ارادہ کر لو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ توکّل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

والحمد للہ رب العالمین وصلّی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ و صحبہ وسلّم

❁❁❁

اسلام میں نماز کا حکم اور اس کی تاکید

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مشہور حدیث ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: توحیدِ باری تعالیٰ اور رسالتِ محمدیؐ کی شہادت‘ نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج۔ توحیدِ باری تعالیٰ اور محمدؐ رسول اللہﷺ کی رسالت کا اقرار کر کے ایک شخص مسلمانوں کی فہرست میں آ جاتا ہے۔ اس کے بعد اسلام کے لازمی تقاضوں پر عمل کرنا اس پر ضروری ہو جاتا ہے اور ان تقاضوں میں پہلا تقاضا نماز ہے‘ جس کی ادائیگی کا اہتمام اُسی وقت کرنا ہوتا ہے‘ کیونکہ روزے رکھنے کے لیے ماہِ رمضان کا انتظار کرنا ہوگا‘ زکوٰۃ اسی وقت ادا کی جائے گی جب اس کے پاس وافر مال پر سال گزر جائے گا۔ اسی طرح حج تو اس پر تب فرض ہوگا جب اسے خانہ کعبہ کا سفر کرنے کے لیے استطاعت ہوگی۔

نماز وہ عبادت ہے جو تمام انبیاء کرام ﷩ کی اُمتوں پر فرض رہی ہے۔ قرآن مجید میں اُمِّ عیسیٰؑ کو بایں الفاظ حکم دیا گیا: ﴿یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴾ (آل عمران) ’’اے مریم! اپنے ربّ کی فرماں برداری کرتی رہو اور سجدہ کرتی رہو اور رکوع کرتی رہو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔‘‘

اسی طرح جب فرشتوں نے حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ ؑ کی پیدائش کی خوشخبری سنائی تو اس وقت وہ محراب میں نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ﴾ (آل عمران:۳۹) ’’فرشتوں نے انہیں ندا دی جبکہ وہ اپنے حجرے میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے‘‘۔ اسی طرح رسول اللہﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا ؕ﴾ (طٰہٰ:۱۳۲) ’’اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس پر جمے رہیے۔‘‘

رسول اللہﷺ نے ساری عمر نماز کی پابندی کی اپنے گھر والوں اور تمام مسلمانوں کو نماز

باجماعت پڑھنے کا حکم دیا‘ کیونکہ قرآن مجید میں حکم وارد ہوا ہے: ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴾ (البقرۃ:۴۳) ’’جھکو (نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ‘‘۔ یعنی باجماعت نماز ادا کرو!

صلوٰۃ عربی لفظ ہے جس کے معانی دعا کے ہیں‘ اور دعا اللہ تعالیٰ ہی سے کی جاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ (الانعام) ’’آپؐ کہیے: میری نماز‘ میری قربانی‘ میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے‘‘۔ نماز مؤمن کی اولین نشانی ہے۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ((بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ)) (صحیح مسلم) ’’بندے اور کفر و شرک کے مابین ترکِ صلوٰۃ ہی کا فاصلہ ہے‘‘۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ((مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَارًا)) (معجم الاوسط للطبرانی) ’’جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اُس نے اعلانیہ کفر کیا‘‘۔ جیسا کہ ذکر ہوا‘ صلاۃ کا معنی دعا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہی بندگی ہے۔ آپﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (سنن الترمذی) ’’دعا عبادت کا مغز ہے‘‘۔ مزید فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (سنن الترمذی) ’’دعا ہی تو عبادت ہے‘‘۔ اور نماز شروع سے آخر تک دعا ہی ہے۔

قرآن مجید میں بتکرار و اعادہ نماز قائم کرنے کا حکم ہے۔ جہاں سچے مسلمان کی صفات کا ذکر ہے وہاں نماز کو اولیت دی گئی ہے۔ فلاح یاب ہونے والے اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴾ (المومنون) ’’اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری محافظت کرتے ہیں‘‘۔ یہاں ان اہلِ ایمان کا ذکر ہے جو اگلی زندگی میں کامیاب ٹھہریں گے۔ پھر سورۃ المعارج میں جہاں کامیاب لوگوں کا ذکر ہے وہاں فرمایا ہے: ﴿الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ ’’جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں‘‘۔ غرض نماز کی تاکید بار بار کی گئی ہے۔

حضور اکرمﷺ نے جب اعلانِ نبوت کیا تو صرف نمازِ تہجد ہی تھی جو رات کے اوقات میں پڑھی جاتی ہے۔ ازاں بعد ہجرتِ مدینہ سے پہلے جب آپؐ کو معراج ہوا تو اُس وقت پنجگانہ نماز فرض کی گئی اور ان کے اوقات کا تعین کیا گیا۔ حضرت جبریل ؑ نے آپﷺ کو ایک دن پانچوں نمازیں اوّل وقت میں پڑھائیں۔ اور دوسرے دن ہر نماز آخری وقت پر

پڑھائی۔ یوں ہر نماز کے لیے شروع اور آخیر کا وقت بتایا گیا ہے جو آج تک اہل ایمان کے ہاں رائج ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ہر نماز کی رکعت اور ان میں کیے جانے والے رکوع اور سجود بھی بتا دیے اور خود ان پر عمل کر کے دکھا دیا اور اُمّت کو ہدایت فرمائی: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) (صحیح البخاری) جب رسول اللہ ﷺ کے وصال کا وقت آیا تو آپؐ نے نماز پنجگانہ کی ادائیگی کی تاکید کی اور یہ بھی کہ غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔

قرآن مجید میں نماز کو اللہ کا ذکر بھی کہا گیا ہے: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴﴾ (طٰہٰ) ''اور نماز قائم رکھو میری یاد کے لیے''۔ رسول اللہ ﷺ کو نماز بہت پیاری تھی۔ آپؐ نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا۔ نماز آپ ﷺ کا پسندیدہ ترین عمل تھا۔ آپؐ نے نماز کی ادائیگی میں غفلت کو بھی بہت برا جانا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵﴾ (الماعون) ''تو بربادی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے' جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں''۔ نماز کا وقت ہو جائے تو فوراً چستی کے ساتھ اٹھ کر نماز کی ادائیگی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ گویا نماز دل کی چاہت اور شوق کے ساتھ پڑھنی چاہیے۔ جو نماز نہیں پڑھتا اس کا تو ایمان مشکوک ہے۔

قیامت کے دن سب سے پہلا سوال نماز کا ہو گا۔ سورۃ الروم میں ارشاد ہے: ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۳۱﴾ ''اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہونا''۔ اور شرک ایسا گناہ ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ نہیں بخشا جائے گا۔ نماز نہ پڑھنے سے اندیشہ ہے کہ مسلمان شرک میں ملوث ہو جائے۔ جب فیصلہ ہو جائے گا اور جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے تو اہلِ جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ قرآن مجید کے الفاظ اس طرح ہیں: ﴿فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۴۰ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۴۱ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝۴۲ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝۴۳﴾ (المدثر) ''وہ جنتوں میں ہوں گے' پوچھتے ہوں گے۔ گنہگاروں کے بارے میں۔ تم لوگوں کو کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟ وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔''

جب رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوا تو پنجگانہ نماز اس وقت فرض کی گئی۔ اوّلاً ایک دن میں

پچاس نمازوں کا حکم ہوا' جو بالآخر کم کر کے پانچ کر دی گئیں۔ مگر پانچ پڑھنے والے کو خوشخبری ملی کہ ثواب پچاس ہی کا ہو گا۔ نماز تو شوق سے ادا کرنے والا عمل ہے۔ ہر نماز کے لیے بلند آواز سے اذان دی جاتی ہے تاکہ ہر مومن وضو کر کے نماز کے لیے تیار ہو جائے (اگرچہ اکثر لوگوں کے پاس گھڑیاں موجود ہیں) اور کوئی دوسری دنیاوی مصروفیت آڑے نہ آئے۔ سورۃ النور میں ارشاد ہوا:

﴿رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝۳۷﴾

''وہ جواں مرد جنہیں غافل نہیں کرتی کسی قسم کی کوئی تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے' نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے۔ (اس سب کچھ کے باوجود بھی) وہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں اُس دن کے تصور سے جس دن الٹ جائیں گے دل اور نگاہیں''

نماز کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ یہ ہر مومن مرد پر فرض ہے۔ پاگل یا دیوانے کے علاوہ کسی کو نماز کی معافی نہیں ہے۔ اگر کوئی بیمار ہے پھر بھی نماز پڑھے' کھڑا نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھے' بیٹھ کر نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر پڑھے' ایسا بھی نہ کر سکے تو اشارے سے نماز ادا کرے۔ نماز کی تاکید اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ عین حالت جنگ میں بھی مجاہدین کو نماز پڑھنے سے استثنا نہیں۔ جنگ کی حالت میں نہ صرف نماز پڑھنے کا حکم ہے بلکہ اس غیر معمولی حالت میں نماز باجماعت پڑھنے کا طریقہ بھی قرآن مجید میں بتایا گیا ہے (سورۃ النساء' آیت ۱۰۲) اسی طرح سفر کی حالت میں نماز میں کمی کر کے پڑھنے کو کہا گیا ہے۔ گویا نماز چھوڑنے کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں۔

نماز کی اہمیت اس قدر ہے کہ منافقین بھی اپنے آپ کو مسلمان جتانے کے لیے نماز کی پابندی کرتے تھے۔ ورنہ ان کو مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا۔ نماز وہ فریضہ ہے کہ جو نمازی کو اچھا انسان بناتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ﴾ (العنکبوت:۴۵) ''اور نماز قائم کریں! یقیناً نماز روکتی ہے بے حیائی سے اور برے کاموں سے''۔ گویا بااخلاق مسلمان بھی وہی ہو گا جو گناہ کے کاموں سے بچتا ہو گا۔ اور اگر کوئی نمازی گناہ کے کاموں سے نہیں رکتا تو پھر وہ جان لے کہ وہ ناقص نماز پڑھتا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان تو سچا ہے کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے۔ نماز کو فلاح کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿١٥﴾﴾ (الاعلیٰ)

''یقیناً وہ کامیاب ہوگیا جس نے خود کو پاک کر لیا۔ اور اُس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔''

نماز اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کامل ذکر ہے۔ جہاں نماز حقیقی فلاح اور کامیابی دلاتی ہے' یعنی حقیقی اور ابدی زندگی میں کامیاب کرتی ہے وہاں نمازی شخص میں کئی دنیاوی خوبیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ نمازی آدمی میں پابندیٔ وقت کی صفت ہوتی ہے' کیونکہ ایک دن میں پانچ مرتبہ کی نماز اسے وقت کی قدر کرنا سکھاتی ہے۔ نمازی آدمی صاف ستھرا رہتا ہے۔ اس کے کپڑے آلودہ نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنے جسم پر معمولی سی گندگی بھی برداشت کرتا ہے۔ نماز ادا کرنے کے لیے وضو کرنا شرط ہے۔ وضو کرنے سے جو اعضاء دھوئے جاتے ہیں ان سے صادر ہونے والے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ نمازی آدمی ہمہ وقت صاف ستھرا رہتا ہے۔ نمازی شخص گھر کے قریب کی مسجد میں نماز پڑھتا ہے' جہاں اس کے گلی محلے کے لوگ جماعت کی نماز میں شامل ہونے کے لیے آتے ہیں۔ اس طرح ان کے ساتھ بار بار ملاقات ہونے سے محبت پیدا ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعارف ہو جاتا ہے' جس کی وجہ سے نمازی افراد ایک دوسرے کے مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ گویا نماز جہاں حقیقی اور پائیدار زندگی کے لیے وسیلہ بن جاتی ہے وہاں انسان کو برائیوں سے بچاتی اور خوش اخلاق بناتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ اعلیٰ عبادت ہے جو انسان کو حقیقی معنی میں اللہ کا عبد یعنی بندہ بنا دیتی ہے۔

افسوس صد افسوس کہ نماز کی اس قدر تاکید اور اہمیت کے باوجود ہمارے مسلم معاشرے کی بڑی اکثریت بے نماز ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر نمازی اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو نماز کی پابندی کرنے کی نصیحت کرتا رہے۔ جس کسی کے کہنے سے ایک شخص بھی نمازی بن گیا تو یہ اس کے لیے بہت بڑے اجر کا باعث ہوگا۔ ❀❀❀

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

بقیہ: عرضِ احوال

اس کے برعکس حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں کہ ان کے ذریعے اُمّت میں تفرقہ و انتشار پیدا نہ ہو۔

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے ''داخلی انتشار'' کا ہے۔ اختلاف اس عالمِ واقعہ کی ایک عظیم اگرچہ تلخ حقیقت ہے۔ تحریکیں اُٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں' پھر ان میں داخلی انتشار رونما ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مدارس میں باہمی سرپھٹول کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیا ہو جاتا ہے۔ ان کے اثرات ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔ اختلافات کے حل کے لیے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں اور جہاں اختلاف نصوص اور بنیادی معاملات کا نہ ہو' بلکہ صرف رائے اور تعبیر و تشریح کا اختلاف ہو' تو جماعت کے نظم بالا کی رائے اور تشریح کو فوقیت دی جانی چاہیے۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

ہمارے نزدیک احیائے اسلام کا یہ عمل کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں' جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرِکار ہیں۔ مثلاً تعلیمی و تدریسی' اصلاحی و تربیتی' تبلیغی و دعوتی' قومی و ملّی اور انقلابی و احیائی' جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اِس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعثِ تقویت ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ دین و مذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبردار تو پوری طرح منظم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں' لیکن دینِ حق کے ماننے والے ابھی اِس بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ دینِ متین کے لیے اجتماعی جِدّوجُہد ضروری ہے یا نہیں؟ یہاں ایک فرمانِ رسول ﷺ کا حوالہ دینا اس بحث کو منطقی انجام تک پہنچاتا ہے: ((اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ ،اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

نوٹ: اس تحریر میں تنظیم اسلامی کے بنیادی لٹریچر ''تعارفِ تنظیم اسلامی'' نامی کتاب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ❀❀❀

اہلِ کلیسا کے اختیارات کی کہانی

رضی الدین سیّد، کراچی ✪

گرجاؤں اور پادریوں کے لامحدود اختیارات کی کہانی بہت دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ اقتدار خواہ کسی کو بھی حاصل ہو، اگر اُس کے دل میں خوفِ خدا اور زندگی بعد موت کے سوال وجواب کا ڈر نہ ہو، تو وہ اقتدار اسے پاگل بنا دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''اختیار گمراہی کا باعث بنتا ہے جبکہ لامحدود اختیار لامحدود گمراہی کا راستہ ہموار کرتا ہے''۔ چرچ کے اختیارات کی کہانی بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ پادریوں نے اپنے عیسائی پیروؤں پر یہ عقیدہ ٹھونس کر بھر دیا ہے کہ وہ زمین پر خدا اور اس کے ''بیٹے'' کے خلیفہ ہیں اور انہی جیسے خدائی اختیارات کے حامل ہیں۔

کہاں تو عیسائیت زمین سے مٹ جانے کے قریب تھی، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تمام تر دعوت وتبلیغ اور مساعی کے باوجود مٹھی بھر افراد ہی ان پر ایمان لا سکے تھے، جبکہ یہودی اور رومی ان کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے، اور کہاں رومی حکومت کے عیسائی مذہب قبول کر لینے کے بعد عیسائیت نے یکا یک ایک اہم دنیاوی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پھر یہیں سے گرجاؤں کے قیام کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ رومی عوام جوں جوں عیسائیت قبول کرتے جا رہے تھے، چرچ کا غلبہ بھی اسی حساب سے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے عیسائی کلیسا کھلتے جا رہے تھے، جہاں سے پادریوں کو ایک غیر معمولی اہمیت ازخود حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ پادریوں نے بھی رومی عیسائی عوام پر اپنے رعب اور اختیارات کا سحر پھونکنا ضروری سمجھا، تاکہ کوئی بھی فرد ان کی اطاعت سے سرتابی نہ کر سکے۔ بائبل کی تشریح کا تمام تر اختیار انہوں نے صرف اپنے پاس رکھا تھا اور کسی 'باہر' کے فرد کو انجیلی آیات کی تشریح وتوضیح کا حق نہیں تھا۔ جس خاص معاملے کو وہ گناہ قرار دے دیتے تھے، وہ معاملہ اسی آن گناہ تسلیم بھی کر لیا جاتا تھا۔ اسی طرح جس فرد کو وہ مرتد ٹھہراتے تھے وہ اُسی آن مرتد قرار پاتا تھا۔ عیسائی رومی عوام کو انہوں نے باور کرایا تھا کہ پادریوں (نائبینِ خدا) کی نافرمانی، خدا کی نافرمانی اور پادریوں کی اطاعت خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے۔

یہ عقیدہ بھی انہوں نے ذہن نشین کروایا تھا کہ ''فادرس'' کی غلطی غلطی نہیں ہوتی، کیونکہ ان کا واسطہ براہِ راست خدا اور آسمانی باپ سے ہوتا ہے۔ نیز کوئی بھی شخص اپنے گناہوں کی معافی خدا سے ازخود نہیں مانگ سکتا، بلکہ اس کے لیے انہیں درمیانی واسطے (پادریوں) کو بیچ میں لانا پڑے گا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے عوام سے ان کے گناہوں کی معافی تلافی کی خاطر اپنے لیے ہدیوں اور تحفوں کی حوصلہ افزائی بھی شروع کر دی، جو مذہبی جوش وخروش میں عوام نے بھی ان پر ازخود نچھاور کرنا شروع کر دیے۔ سلسلہ آگے بڑھا تو جھاڑ پھونک اور دعائیں بھی شروع ہو گئیں، جن کی خاطر عورتیں اور نوجوان لڑکیاں بھی وہاں لائی جانے لگیں۔ پادری ان سے کبھی سب کے سامنے اور کبھی خلوت میں سوالات کرتے اور سروں پر ہاتھ پھیر کر تقدّس کا درجہ عطا کرتے۔ خلوت میں ان کے ہاتھ لڑکیوں کے سروں سے اتر کر جسم کے دوسرے حصوں پر بھی پہنچ جاتے۔ یوں بدچلنی کے راستے ان کے لیے ازخود کھلنے شروع ہو گئے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ چھوٹے بچوں اور کم عمر لڑکوں پر بھی ہاتھ کی صفائی دکھانے لگے۔ بدقسمتی سے یہ سارے سلسلے آج بھی جاری ہیں۔ دنیا بھر میں کوئی ایک پادری بھی شاید آج ایسا نہ ملے جس نے اپنے گرجا کے اندر ناشائستہ وارداتیں نہ کی ہوں، حتیٰ کہ اس عمل سے پاپائے اعظم خود بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔ پادریوں کی ان جنسی حرکات کی خبریں آئے دن غیر ملکی اور پاکستانی اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ نعوذ باللہ! جب وہ حضرت یعقوب، حضرت نوح اور حضرت سلیمان علیہم السلام وغیرہ جیسے جلیل القدر انبیاء کو بھی ان کی بیٹیوں، بہنوں، ماؤں اور محلے دار عورتوں کے ساتھ بلا جھجک ملوث کروا سکتے ہیں تو آخر کار خود اس سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہوں گے؟

اہلِ کلیسا بعض اوقات اپنے سائلین پر غیظ وغضب کا دانستہ اظہار بھی کرتے تھے، تاکہ ان کے پیروان کی عظمت کے آگے سہم جائیں اور ان پر انگلی اٹھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔ پادریوں نے انہیں یہ بھی باور کروا دیا تھا کہ خدائی نائب ہونے کی وجہ سے وہ اگر کسی کو معافی نامہ لکھ کر دے دیں تو خود ''خدائے خداوند'' بھی اسے ردّ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی کے ساتھ انہوں نے معافی ناموں کی فروخت کا دھندا بھی شروع کر دیا۔ کہا گیا کہ گناہ کرو، اعتراف کرو، پوپ کو قیمت ادا کرو، اور ''ایسے پاک ہو جاؤ جیسے تم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہو''۔ انہوں نے ''ایک گناہ، ایک معافی نامہ'' اور ''جتنا بڑا گناہ، اتنا بڑا معافی نامہ'' کے اصول طے کر دیے۔ یوں ایک جانب گناہوں کی بھر مار ہونے لگی اور دوسری جانب کلیساؤں میں دولت کے ڈھیر

✪ ای میل: national.a.research@gmail.com

بڑھنے لگے۔ (ہمارے ہاں بھی بعض بزرگان اپنے مریدوں کے لیے خدا تعالیٰ سے لڑتے اور اس سے اپنی بات منوا کر دم لیتے ہیں۔ زندگی میں تو کم‘ بعد از مرگ زیادہ!)

اس طرح ان کی ہیبت و دھاک ہر طرف بیٹھتی چلی گئی۔ گناہ گاروں (مخالفوں) کے لیے انہوں نے جسمانی عذاب کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ یعنی ہر مخالف فرد کو قتل کیا گیا‘ جلایا گیا‘ یا چیر پھاڑ کی گئی۔ یہودیوں‘ پروٹسٹنٹوں‘ سائنسدانوں اور مسلمانوں پر انہوں نے اتنے لرزہ خیز مظالم توڑے ہیں کہ انسانیت آج بھی انہیں پڑھتی ہے تو چیخ چیخ اُٹھتی ہے۔

مسلمانوں اور یونانیوں سے اخذ کردہ بعض علوم چونکہ پوپ کے قدیمی و راسخ اختیارات کو چیلنج کرتے تھے (جھوٹا ثابت کرتے تھے)‘ اس لیے علم حاصل کرنے والے عیسائیوں پر پوپ بدترین سختیاں کرتے‘ اور سیدھے سیدھے عیسائیت سے خارج کر دیتے تھے۔ کوپرنیکس ایک عیسائی سائنسدان تھا۔ پوپس کے نظریے کے برعکس اُس نے یہ اصول دیا تھا کہ ’’زمین سورج کے گرد گھومتی ہے‘‘۔ اس بات پر پادریوں نے اس پر اتنی سختیاں کیں کہ بیچارا اپنے نظریے ہی سے دستبردار ہو گیا اور پوپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اور بائبل ہاتھوں میں لے کر اس نے اپنے اس ’’گناہِ عظیم‘‘ کی معافی مانگی۔

پوپ کا اقتدار وسیع تر ہوتا چلا گیا‘ حتیٰ کہ اُس نے ’’شہنشاہوں‘‘ کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا‘ یہاں تک کہ بادشاہانِ ریاست اس سے دائمی اقتدار کے پروانے حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جس نمایاں شخصیت کو پاپائے اعظم نے پروانۂ اقتدار عطا کیا‘ بس وہی شہنشاہ بننے کا حقدار قرار پایا‘ جس کے ساتھ بادشاہ کے ’’ظلِ الٰہی‘‘ (خدا کا سایہ) ہو جانے کا تصور بھی پیوستہ ہو گیا۔ کلیساؤں کے لیے بادشاہ کی جانب سے جاگیریں وقف کی جانے لگیں‘ جبکہ پاپاؤں کی جانب سے حکمرانوں کو حقِ حکمرانی عطا کیا جانے لگا۔ اکثر اوقات پاپائے اعظم کی دولت و جاگیر شہنشاہِ اعظم کی دولت و جاگیر سے بھی آگے بڑھنے لگی۔ اُس دور کے بادشاہ پوپ کے سامنے اقرار کرتے تھے کہ وہ خدا اور اُس کے نائب پاپائے اعظم کا تا زندگی وفادار رہے گا۔ آٹھویں صدی کے آخر میں تو چرچ مغرب کا آمرِ مطلق ہی بن چکا تھا۔ اُس نے شہنشاہی دینے والے اور شہنشاہی چھیننے والے دونوں اداروں کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان کے غضبناک خدائی اختیارات کے باعث سرکش شہنشاہ تک کئی بار اس کے آگے ہاتھ باندھ باندھ کر جھکنے پر مجبور ہوتے تھے۔ (ایسی بعض تصویریں آج بھی دستیاب ہیں۔ دیکھیں انسائیکلو پیڈیاز)

پوپ کے پاس اگرچہ سب کچھ تھا‘ مگر فوج نہیں تھی۔ پھر بھی اختیارات کی فراوانی کا حال

یہ تھا کہ اُس کا ایک فرمان ہی باغی شہنشاہ کے خلاف دیگر خطوں کے بادشاہوں کی افواج کو حرکت میں لے آتا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف عیسائی صلیبی جنگیں بھی دراصل ہر جگہ کے چھوٹے بڑے پادریانِ کلیسا کے جوشِ خطابت کا نتیجہ تھیں‘ جس کے باعث ہر یورپی ملک کا بادشاہ اور اس کے عوام مسلمانوں کو مارنے اور ’’جنّت کے حصول‘‘ کی خاطر ننگی تلواریں لیے جوق در جوق یروشلم بھاگے چلے جاتے تھے۔

پوپ نے ایک شہنشاہ ’’ہنری‘‘ کو جب اپنی نافرمانی کے الزام میں ’’مذہب سے خارج‘‘ کرنے کی سزا سنائی تو مملکت میں ہر طرف اس کے خلاف ایک بے چینی اور بغاوت کی فضا پیدا ہو گئی۔ چنانچہ بہت مجبور ہو کر ’’ہنری‘‘ نے پوپ گریگوری ہفتم کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے معافی طلب کی۔ اسی طرح سسلی (اٹلی) کے ایک اور عیسائی بادشاہ ’’فریڈرک‘‘ نے بھی جب پوپ کے اختیارات کو چیلنج کیا تو پوپ گریگوری نہم نے اسے مرتد قرار دے کر اپنا فتویٰ ہر اُس شہر تک پہنچا دیا جہاں تک فریڈرک کے قدم پہنچے تھے۔

بہرحال ہر ظلم اور ہر عروج کی ایک حد ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پادریوں کی اصل حقیقت لوگوں پر ظاہر ہونے لگی۔ نیز علم اور سائنس کے سیلاب نے بھی پادریوں کے عقائد کا گلا گھونٹ دیا۔ بادشاہانِ ریاست بھی ان کے اقتدار سے باہر آنے لگے اور آج حال یہ ہے کہ پادریوں کی قدر و قیمت وہاں انتہا سے زیادہ گھٹ گئی ہے‘ جبکہ کلیسا آئے دن فروخت ہو ہو کر مساجد میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ پوپ کا اقتدار زمین میں بالکل ہی دفن ہو گیا ہو۔ بہت سے اختیارات آج بھی اسی کے ہاتھوں میں ہیں۔ بہت ساری حیثیتوں سے وہ آج بھی زندہ ہے۔ خدائی نیابت کے اختیارات اور اپنے جوشِ خطابت کے ذریعے وہ نت نئے راستے نکالتا ہی رہتا ہے۔

اختتام پر ہم وہ قولِ زریں ایک بار پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ ’’اختیار گمراہی کا باعث بنتا ہے اور لامحدود اختیار لامحدود گمراہی کا راستہ ہموار کرتا ہے‘‘۔ پادریوں کے عروج و بلندی کی یہی ساری کہانی ہے۔ شکر ہے کہ اسلام میں عیسائی پادریوں کی مانند‘ علماء نے بخشش و جنّت کا خدائی اختیار اپنے ہاتھوں میں نہیں لیا تھا‘ جس کے باعث ہم اَن گنت برائیوں سے محفوظ رہتے رہے ہیں۔ پھر بھی بہت کچھ منفی باتیں حجروں اور خانقاہوں کے ساتھ وابستہ نظر آ ہی جاتی ہیں۔

❁❁❁

تاریخِ یہود اور مسئلۂ فلسطین

ڈاکٹر ساجد خاکوانی ☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں‘ حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کو منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے عرب اقوام نے جنم لیا اور دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے فرزندِ ارجمند جو اللہ تعالیٰ کے بڑے ہی برگزیدہ نبی ہوئے اور قرآن مجید میں ان کا متعدد بار تذکرہ کیا گیا ان کا نام حضرت یعقوب علیہ السلام تھا۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے ’’اسرائیل‘‘ کا لقب عطا کیا‘ جو عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ’’اللہ تعالیٰ کا بندہ‘‘ ہے۔ عربی میں ’’ابن‘‘ بیٹے کو کہتے ہیں اور ’’بنو/ بنی‘‘ اس کی جمع ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے‘ جن سے اُن کی نسل چلی۔ ان بیٹوں اور ان کی نسل کو قرآن نے ’’بنی اسرائیل‘‘ (یعنی اولادِ یعقوبؑ) سے یاد کیا ہے۔ ’’یہودہ‘‘ نامی لڑکا حضرت یعقوب علیہ السلام کا چوتھا بیٹا تھا جس کے ہاں اولادِ نرینہ بہت تھی‘ اور بنی اسرائیل کا ہر دوسرا تیسرا نوجوان ’’یہودہ‘‘ کا بیٹا یا پوتا ہوتا تھا‘ جس وجہ سے اس قبیلے کو ’’یہودی‘‘ کہا جانے لگا جو آج تک مروّج ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانۂ اقتدار میں یہ قبیلہ اپنے آبائی علاقے سے مصر منتقل ہوا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد تقریباً چار سو سال تک ان پر تاریخ کی بدترین غلامی مسلّط رہی اور مصر کے مقامی لوگوں نے انہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا۔ ان کا ہر حکمران فرعون کہلاتا تھا۔ فرعونوں اور فرعونیوں نے بنی اسرائیل پر بے پناہ تشدد کیا‘ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ان لوگوں نے مصر سے ہجرت کی اور صحرائے سینا میں آن وارد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ارضِ فلسطین کے حصول کی خاطر قتال کرنے کا حکم دیا‘ لیکن قتال سے انکار پر چالیس سال تک صحرا نوردی ان کا مقدر بنی رہی‘ یہاں تک کہ وہ

☆ ای میل: drsajidkhakwani@gmail.com

ساری نسل ختم ہوگئی جس نے قتال سے انکار کیا تھا۔

غلامی کے داغ سے محفوظ بنی اسرائیل کی نئی نسل نے یوشع بن نون کی سرکردگی میں جہاد وقتال کیا تو فلسطین فتح ہوگیا۔ لیکن انہوں نے ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی بارہ حکومتیں بنالیں اور آپس میں لڑتے بھی رہے۔ تین سو برس بعد جب ان پر دنیا تنگ ہو گئی تو انہوں نے وقت کے نبی حضرت سیموئیلؑ سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ یعنی سپہ سالار مقرر کر دیجیے‘ اب ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے۔ چنانچہ ان کے لیے طالوت کو سپہ سالار مقرر کر دیا گیا‘ انہوں نے طالوت کی قیادت میں قتال کیا اور انہیں تمدنی زندگی نصیب ہوئی۔

حضرت داؤد علیہ السلام بھی بنی اسرائیل میں سے تھے اور آپؑ طالوت کی فوج میں شامل تھے۔ طالوت کی نرینہ اولاد نہ تھی‘ اُس نے اعلان کیا کہ جو دشمن کے سپہ سالار ’’جالوت‘‘ کو قتل کرے گا وہ اپنی بیٹی اُس سے بیاہ دے گا۔ چنانچہ یہ سعادت حضرت داؤد علیہ السلام کے حصے میں آئی۔ طالوت کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام حکمران بنے اور اپنے زمانے کے بڑے ہی عظیم الشان حکمران بنے۔ لوہے کی ٹیکنالوجی کا آغاز آپؑ کے زمانے میں ہی ہوا۔ آپؑ کے اقتدار‘ فوج‘ خزانہ‘ لوہے کی صنعت اور رعب داب کا قرآن کریم نے بھی ذکر کیا ہے۔ آپؑ پر آسمانی کتاب ’’زبور‘‘ بھی نازل ہوئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد آپؑ کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے‘ جنہیں اللہ تعالیٰ نے جِنّات اور دیگر مخلوقات پر بھی اقتدار عطا کیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد آپؑ کا بیٹا ’’رجعام‘‘ جب تخت نشین ہوا تو سلطنت اس کے قابو میں نہ آسکی اور ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اُس زمانے میں ایک حصے کا نام ’’اسرائیل‘‘ اور دوسرے کا نام ’’یہودیہ‘‘ تھا۔ ان کے درمیان اگرچہ لڑائیاں بھی رہیں‘ لیکن جلد ہی صلح صفائی ہوگئی۔

یہودی آج تک یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ پر ان کا حق ہے‘ اور اس کی وجہ ان کے نزدیک کچھ یوں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ دیا تھا‘ ان کے ایک بیٹے سے یہودی ہیں اور دوسرے سے عرب اقوام۔ یہودی یہ کہتے ہیں کہ اس بنیاد پر آدھے مشرقِ وسطیٰ پر عربوں کا حق ہے اور بقیہ آدھے پر یہود کا۔ لیکن یہ موقف اس لیے غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلافتِ ارضی کسی نسلی تفوق کی بنیاد پر عطا نہیں کی تھی‘ یہ خالصتاً تقویٰ پر بنیاد کرتی ہے۔ اگر یہود اللہ تعالیٰ کو اتنے ہی عزیز ہوتے تو ختمِ نبوت آلِ اسمٰعیل میں کیوں واقع ہوتی اور

قرآن مجید جیسی عظیم الشان کتاب ارضِ حجاز کی بجائے فلسطین و یروشلم میں کیوں نہ نازل ہوتی؟ یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نسلوں اور علاقوں سے زیادہ متقی و پرہیز گار لوگوں سے پیار ہے اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں‘ خواہ کسی نسل‘ رنگ اور علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہود نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت سے لے کر آج تک اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ محسنِ انسانیت حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ قرآن حکیم نے یہ بات بایں الفاظ بیان فرمائی ہے: ﴿اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۶) ’’جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ اس (نبی ﷺ) کو یوں پہچانتے ہیں جیسے اپنے سگے بیٹوں کو‘‘۔ لیکن محض نسلی تفرق کی بنیاد پر جانتے ہوئے بھی ماننے سے گریزاں ہیں۔

یہودیوں کے تین قبائل نبی آخر الزماں ﷺ کی تلاش میں ہی یثرب کے مقام پر آ کر آباد ہوئے تھے‘ کیونکہ گزشتہ آسمانی کتب میں یہی لکھا تھا کہ نبی آخر الزماں ﷺ یثرب کے مقام پر اپنی ریاست بنائیں گے۔ لیکن جب نبی مکرم ﷺ آن پہنچے تو یہود محض اس تعصب کی وجہ سے ان پر ایمان نہ لائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بعثت بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسمٰعیل میں کیوں کر دی‘ حالانکہ یہ خالصتاً خدائی فیصلہ تھا۔

اگرچہ محسنِ انسانیت ﷺ نے یہود سے معاہدے کر کے انہیں مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی تھی‘ لیکن اس بدعہد قوم کی مسلسل ریشہ دوانیوں کے باعث نبی مکرم ﷺ نے انہیں مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن پھر بھی ان کی سازشیں کم نہ ہوئیں تو آپ ﷺ وصیت فرما گئے کہ یہود کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں وہاں سے نکال دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کم وبیش ایک صدی قبل مسیح سے یہ لوگ اپنے وطن سے دور دربدر کی ٹھوکریں کھاتے چلے آ رہے تھے‘ اور یوں گزشتہ صدی کے نصف اوّل تک یہ لوگ دو ہزار سال سے غریب الدیار تھے۔ یہودیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ اس قوم نے اپنا بہترین وقت ہسپانیہ میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں گزارا ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے انہیں بہت سی رعایات اور خاص طور پر ان کے پڑھے لکھے لوگوں کو بہت سی مراعات دے رکھی تھیں۔ لیکن محسن کشی ہمیشہ سے اس قوم کی فطرت میں رہی ہے۔ چنانچہ چڑھتے سورج کے پجاری ہونے کے مصداق

مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی آنکھیں پھیرنے میں ذرا بھی توقف نہیں کیا۔ گزشتہ صدی میں جرمنی میں نازیوں کے ہاتھوں ان کا بے دریغ قتل عام کیا گیا‘ جس کے باعث ان کی نسل ختم ہوتی نظر آ رہی تھی‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے ناشکری‘ غداری اور بے وفائی سے عبارت عبرت کے اس نشان کو شاید قیامت تک باقی رکھنا ہے‘ چنانچہ نہ جانے کن کن مصالح کے تحت قدرت نے انہیں عارضی طور پر اسرائیل کی پناہ گاہ عطا کی‘ تاکہ ان کی نسل ختم ہونے سے بچ جائے۔

تاریخ فلسطین پر نظر دوڑائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ۲۰/اگست ۶۳۶ کو عرب فاتحین نے فلسطین کو فتح کیا تھا اور یہ قبضہ پُرامن طریقہ سے عمل میں آیا تھا۔ ۴۶۳ سال تک یہاں عربی زبان اور اسلام کا دور دورہ رہا۔ تاہم یہودی ایک اقلیت کی حیثیت سے موجود رہے۔ گیارہویں صدی کے بعد یہ علاقہ غیر عرب سلجوق‘ مملوک اور عثمانی سلطنتوں کا حصّہ رہا۔ ۱۰۹۹ء میں پہلی صلیبی جنگ کے موقع پر یورپی صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے ۷۰ ہزار مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کیا اور یہاں دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

چار صدیوں تک عثمانیوں کی حکمرانی کے بعد ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے اس خطے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ’’اعلانِ بالفور‘‘ کے ذریعہ یہودیوں کے لیے ایک قومی ریاست کے قیام کا وعدہ کیا گیا۔ فلسطین کی جانب یہودیوں کی نقل مکانی سترہویں صدی کے اواخر میں شروع ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۰ء تک نازی جرمنی کے یہودیوں پر مظالم کی وجہ سے اس میں بہت اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۲۰ء‘ ۱۹۲۱ء‘ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں عربوں کی طرف سے یہودیوں کی نقل مکانی اور اِس علاقے میں آمد کے خلاف پُرتشدد مظاہرے ہوئے‘ لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعہ فلسطین کو تقسیم کر کے ایک عرب اور ایک اسرائیلی ریاست قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ نے اس علاقے سے ۱۹۴۸ء میں اپنی افواج واپس بلا لیں اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

قلب فلسطین میں اسرائیل کی تاسیس کسی جنگ اور فتح کا نتیجہ نہیں ہے‘ بلکہ اسرائیل کا قیام سازشوں کے نتیجے میں مذاکرات اور معاہدوں کے بعد وجود میں آیا‘ اور تاریخ گواہ ہے کہ آج

تک معاہدے اور مذاکرات ہی اس ناپاک ریاست کے وجود کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ ریاست اسرائیل کو وجود بخشنے کے لیے سب سے پہلے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی سیکرٹری خارجہ آرتھر جیمز بالفور نے اپنی حکومت کی طرف سے ایک اعلامیہ (declaration) جاری کیا' جسے ''اعلانِ بالفور'' کے نام سے تاریخ میں لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اس اعلامیہ کی منظوری برطانوی کابینہ کے اجلاس منعقدہ ۱/۳۱ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں دی گئی تھی۔ یہ اعلامیہ مذکورہ سیکریٹری خارجہ کی طرف سے برطانوی یہودی کمیونٹی کو ارسال کیا گیا تھا' جس میں برطانوی حکومت کی طرف سے اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ فلسطینیوں کے قومی وطن کو یہودیوں کی آماجگاہ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ اعلامیہ صہیونی تحریک کی کتنی بڑی کامیابی تھا' اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج تک پوری دنیا کے یہودیوں اور اسرائیل کے اندر ۲ نومبر کی تاریخ کو ایک قومی دن کے طور پر تہوار کی صورت میں منایا جاتا ہے۔ اس اعلامیے کی اصل دستاویز شاہی لائبریری برطانیہ میں آج بھی محفوظ ہے۔

اسرائیل کے قیام کے لیے پہلی باقاعدہ تحریک ۱۹۱۹ء کی امن کانفرنس کے بعد پیش کی گئی۔ اس ''امن کانفرنس'' کا نتیجہ بہت جلد دوسری جنگ عظیم کے طور پر دنیا کو بھگتنا پڑا۔ یہ کانفرنس پہلی جنگ عظیم کے بعد پیرس میں منعقد ہوئی اور اس میں دنیا کے تیس بڑے ممالک دنیا کے نئے نقشے کی ترتیب کے نام پر بندر بانٹ میں مصروفِ کار رہے۔ اس کانفرنس کے فیصلے کے نتیجے میں فلسطین کے صوبے کو سلطنت عثمانیہ سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے بعد صہیونی تنظیم نے اسرائیل کے خواب کا پہلا مسودہ ۳ فروری ۱۹۱۹ء کو پیش کیا۔ اس مسودے میں پانچ بنیادی نکات تحریر تھے' جن کا خلاصہ اور لُبِ لُباب یہ تھا کہ فلسطینی علاقے کو یہودیوں کی سرزمین کی حیثیت سے اصولی طور پر تسلیم کیا جائے۔ اس کانفرنس میں اس مسودے کو یادداشت کی حیثیت دی گئی' گویا دوسرے لفظوں میں ایک طرح سے مان لیا گیا۔ یاد رہے کہ اسی امن کانفرنس کے نتیجے میں ''لیگ آف نیشنز'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔

امن کانفرنس کے نتائج تو غیروں سے تعلق رکھتے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کے قیام میں اپنوں نے بھی کوئی کم کردار ادا نہیں کیا۔ قیام اسرائیل کا پہلا تاسیسی معاہدہ دراصل شاہِ حجاز (سابق شریفِ مکّہ) حسین الہاشمی کے بیٹے امیر فیصل اور ہائم ویزمین یہودی کے درمیان ہونے

والا معاہدہ تھا' جس پر ۳ جنوری ۱۹۱۹ء کو ان دونوں نے دستخط کیے۔ شاید اسی کامیابی کے نتیجے میں ہائم ویزمین یہودی کو بعد میں عالمی صہیونی تنظیم کا صدر بھی بنا لیا گیا تھا۔ یہ معاہدہ عرب یہود تعاون کا معاہدہ تھا' اس وعدے کے ساتھ کہ ایک فریق فلسطین میں یہودی ریاست کی راہ ہموار کرے گا تو دوسرا فریق بقیہ مشرقِ وسطیٰ کو عرب سرزمین کے طور پر تسلیم کر لے گا۔ اس معاہدے کے دوران ہائم ویزمین یہودی نے عرب لباس زیب تن کیے رکھا تاکہ دوستی کا ناٹک برقرار رہے۔ اس معاہدے کے فوراً بعد ہائم ویزمین پیرس کے لیے روانہ ہو گیا جہاں اس نے امن کانفرنس میں صہیونی تنظیم کے وفد کی سربراہی کی۔ امیر فیصل اور ہائم ویزمین یہودی کے درمیان اس معاہدے کے لیے برطانوی خفیہ ایجنسی ایک عرصے سے متحرک تھی اور اس سے پہلے بھی ۱۹۱۸ء میں امیر فیصل کو شیشے میں اتارنے کے لیے ہائم ویزمین یہودی کے ساتھ متعدد ملاقاتوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ اسی امیر فیصل بن الحسین الہاشمی کا ذکر علّامہ اقبال نے اپنے شعر میں کیا تھا: ؎

کیا خوب امیرِ فیصلؔ کو سنوسی نے پیغام دیا
تُو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا!

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس معاہدے میں یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ امن کانفرنس کے بعد ایک کمیشن کے ذریعے عرب ریاست اور یہودی ریاست کی حدود کا تعین بھی کیا جائے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ''تنظیم اقوامِ متحدہ'' (UNO) کا ادارہ قائم ہوا اور ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی کی قرارداد نمبر ۱۸۱ کے ذریعے فلسطین کے علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۳۲ فیصد یہودی آبادی کو ۵۶ فیصد علاقہ مرحمت کر دیا گیا اور بقیہ ریگستانی علاقہ فلسطینیوں کی قسمت میں لکھ دیا گیا۔ یہ تنظیم اقوام متحدہ کا ابتدائی تاریخی کردار ہے کہ یہ ادارہ اپنے آغاز سے ہی بڑی طاقتوں کے خنجر کے طور پر اُمّتِ مُسلمہ کی کمر میں پیوست ہوتا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء کے آخر میں فلسطینیوں نے اپنے ایمان و زمین کے تحفظ کی سول جنگ شروع کر دی اور ۱۹۴۸ء کے آغاز تک عرب افواجِ آزادی کے نام سے دیگر عرب علاقوں سے بھی سرفروشانِ اسلام اس جنگ میں شریک ہو گئے۔ ''امنِ عالم'' کے ٹھیکیدار برطانیہ کے بوئے ہوئے اس بیج پر ۱۹۴۸ء کے وسط میں باقاعدہ عرب اسرائیل جنگ شروع ہو چکی تھی اور دونوں

طرف سے بھاری توپ خانے کا استعمال اور بعد میں فضائی حملے بھی شروع ہو گئے۔ بڑی طاقتوں کی مداخلت پر ایک بار پھر ’’مذاکرات‘‘ کی میز بجی اور ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء کو مصر نے‘ ۲۳ مارچ کو لبنان نے‘ ۳/اپریل کو اردن نے اور ۲۰ جولائی ۱۹۴۹ء کو بالآخر شام نے بھی اس عارضی امن معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں فلسطین اور اردن کا ۱۸ فیصد مزید علاقہ اسرائیل کو مل گیا‘ جو تنظیم اقوام متحدہ کے اعلان کردہ علاقے سے پچاس فیصد زائد تھا۔ نتیجۃً لاکھوں فلسطینی بے گھر ہو گئے اور ہزاروں عرب شہداء کے خون رائیگاں گئے‘ لیکن اس معاہدے کے بعد مغربی آقا اور اسرائیلی حکمران عرب قیادت سے بہت خوش ہو گئے۔

۱۹۴۹ء کے عارضی امن معاہدے کے نتیجے میں قائم ہونے والی سرحد ’’خطِ سبز‘‘ کہلائی‘ جو ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ تک اسرائیل اور پڑوسی ممالک کے درمیان ملکی سرحدوں کا کام کرتی رہی۔ اسرائیل کے قیام سے آج تک امن معاہدے‘ مذاکرات‘ اقوام متحدہ کی قراردادیں اور عالمی سفارتی دباؤ صرف اُمّت مسلمہ کی نام نہاد قیادت کو دبانے کے کام ہی آتی رہی ہیں‘ اور اسرائیل کو یہ سب کچھ خونی جنگوں سے بھی نہیں روک سکا۔ چنانچہ جب بھی اسرائیل کو اپنی آبادی کے لیے علاقے اور زمین کی ضرورت پڑتی ہے وہ دنیا بھر کے قوانین اور اخلاقی و انسانی معیارات کو بالائے طاق رکھ کر پڑوسیوں پر چڑھ دوڑتا ہے اور عالمی طاقتیں ہمیشہ اسی کا ساتھ دیتی ہیں۔ اسی کی ایک مثال ۱۹۶۷ء کی تیسری عرب اسرائیل جنگ ہے۔ یہ چھ روزہ جنگ ۵ جون سے ۱۰ جون ۱۹۶۷ء کے دوران جاری رہی‘ جو مصر اور اسرائیل کے درمیان تو براہِ راست رہی‘ اور اردن جس نے مہینہ بھر قبل ۳۰ مئی کو مصر سے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کیا تھا وہ بھی چاروناچار اس میں شریک ہو گیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں اسرائیلیوں نے غزہ کی پٹی کے علاوہ صحرائے سینا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مشرقی یروشلم کا علاقہ‘ شام کی گولان کی پہاڑیاں اور غرب اردن کا علاقہ بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ یوں مسلمانوں کا قبلۂ اوّل یہود کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۰ جون کو اقوام متحدہ نے جنگ بندی کرا دی اور معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس جنگ کے بعد کم وبیش دس لاکھ عرب مسلمان نفوس اس علاقے میں اسرائیل کے زیر تسلط آ گئے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد ستر کی دہائی میں ’’امن مذاکرات‘‘ کا پھر باقاعدہ آغاز ہوا اور اسرائیلی تنازع کے حل کے لیے کچھ عرب ریاستیں اس بات پر آمادہ ہوئیں کہ بات

چیت کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جانا چاہیے۔ ان مساعی کے آغاز کے بعد سب سے پہلے مصر اسرائیل امن معاہدہ عمل میں آیا اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء کو واشنگٹن ڈی سی کے اندر اس پر دونوں ریاستوں کی مقتدر شخصیات نے دستخط کیے۔ یہ معاہدہ کیمپ ڈیوڈ ملاقات کا نتیجہ تھا جو اس معاہدے سے کم وبیش ایک سال قبل ۱۹۷۸ء میں منعقد ہوئی تھی۔ امریکہ کی ثالثی میں مصر کے صدر انور سادات نے اسرائیلی وزیر اعظم سے یہ ملاقات کی اور اس سے پہلے اسی مصری صدر نے ۱۹۷۷ء میں اسرائیل کا دورہ بھی کیا تھا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں دونوں ریاستوں نے ایک دوسرے کے حق حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں قبضہ کیے گئے کچھ علاقے مصر کو لوٹائے تھے اور مصر نے اسرائیل کو اجازت دی تھی کہ وہ نہر سویز کو اپنے جہازوں کے استعمال میں لا سکتا ہے۔ اس طرح مصر وہ پہلا عرب ملک تھا جس نے اسرائیل کے ناپاک وجود کو تسلیم کیا‘ جس کے نتیجے میں مصر کو عالم اسلام کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور مصر کی اسلامی سربراہی کانفرنس کی رکنیت بھی معطل رہی۔ اس معاہدے کے کچھ ہی مدت بعد مصر کے اسلامی جہاد کے نوجوانوں نے اس معاہدے کی پاداش میں صدر انور سادات پر قاتلانہ حملہ کر کے انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ جولائی ۱۹۸۰ء میں اسرائیل نے مشرقی یروشلم سمیت پورے یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دے دیا۔

۱۹۹۱ء کی خلیج جنگ کے بعد عرب اسرائیل تنازعے کے حل کی ایک اور کوشش کی گئی۔ اس بار اسپین نے میزبانی کی اور روس بھی اس کے ساتھ شریک کار رہا۔ اسی طرح دوسرے ممالک کو بھی فکر ہوئی کہ عرب اسرائیل تنازعہ حل کرایا جائے‘ کیونکہ خلیج کی جنگ میں ان انسانیت کے ٹھیکیداروں کے معاشی مفادات داؤ پر لگ گئے تھے۔ چنانچہ ۳۰/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو اسپین کے دارالحکومت میں امن کانفرنس کا انعقاد کیا گیا‘ جو تین دن تک جاری رہی اور اسرائیلی و فلسطینی نمائندوں کے علاوہ لبنان‘ اردن اور شام سمیت متعدد عرب ممالک بھی شامل ہوئے۔ اس امن کانفرنس سے کیا نتیجہ نکلنا تھا‘ اس بات کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ’’امن کانفرنس‘‘ کی منصوبہ کاری امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش اور وزیر خارجہ جیمز بیکر نے تیار کی تھی۔ مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی پالیسی بلامبالغہ ان محاوروں پر پوری اترتی ہے کہ اندھا ہمیشہ اپنوں میں ہی ریوڑیاں بانٹتا ہے اور بلّی سے چھیچھڑوں کی چوکیداری کی توقع عبث ہے۔

مسئلہ فلسطین میں عرب ممالک اسی طرح امریکہ کی طرف دیکھتے رہتے ہیں جیسے لڑنے والی بلیاں روٹی کی تقسیم پر بندر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

۲۰/ اگست ۱۹۹۳ء کو ناروے کے شہر اوسلو میں بھی اسی طرح کا ایک کھیل کھیلا گیا اور اسپین کی امن کانفرنس کی سفارشات کی روشنی میں ایک معاہدہ تیار کیا گیا جسے اوسلو معاہدے کا نام دیا گیا۔ ۱۳/ ستمبر ۱۹۹۳ء کو واشنگٹن ڈی سی کے اندر امریکی صدر، فلسطینی راہنما یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن کی موجودگی میں محمود عباس نے فلسطینیوں کی طرف سے، اسرائیل کے وزیر خارجہ شمعون پیریز نے اپنے ملک کی طرف سے، امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے امریکہ کی طرف سے اور روسی وزیر خارجہ اینڈری کوزریو نے اپنی حکومت کی طرف سے اس پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کی خاص بات یہ تھی کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ فلسطینی راہنما اور اسرائیلی قیادت براہ راست آمنے سامنے بیٹھے تھے اور بھری محفل میں انہوں نے بہت سے لوگوں کے سامنے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں فلسطینی نیشنل اتھارٹی وجود میں آ گئی۔ یہ ایک طرح فلسطینی ریاست کی راہ ہموار کرنے کا ایک عندیہ تھا جس کے بدلے فلسطینی قیادت نے اسرائیل کو تسلیم کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس معاہدے پر فلسطینیوں کے اندر شدید بے چینی پھیل گئی اور بہت شدید مخالفت سامنے آئی۔ فلسطینیوں کے مذہبی اور محبِ وطن عناصر نے اس معاہدے کو یکسر مسترد کر دیا اور اسے شہدائے فلسطین کے خون سے غداری قرار دیا۔

اسی طرح کا ایک معاہدہ طویل قتل و غارت گری کے بعد شدید دباؤ کے نتیجے میں اردن سے بھی کرایا گیا اور ۱۹۹۴ء میں اردن اور اسرائیل کے حکومتی نمائندوں نے اردن اسرائیل امن معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اوسلو معاہدہ جو یاسر عرفات اور اسرائیل کے درمیان ہوا اس کے نتیجے میں اردن کو فلسطینی تنازع سے ایک حد تک باہر کر دیا گیا تھا اور یوں ۲۵ جولائی ۱۹۹۴ء کو واشنگٹن ڈی سی کے اندر ہی اردن کے شاہ حسین اور اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن نے امریکی صدر کی موجودگی میں دستخط کیے، اور یوں اردن وہ دوسرا عرب ملک قرار پایا جس نے اُمتِ مسلمہ کی خواہشات کے برعکس اسرائیل کے ناپاک وجود کو تسلیم کر لیا۔ ۲۶/ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو اردن اور اسرائیل نے ایک اور معاہدے پر دستخط کیے۔ یہ معاہدہ اسرائیل کی ایک وادی میں

کرایا گیا، جس پر اسرائیلی وزیر اعظم اور اردن کے وزیر اعظم نے دستخط کیے۔ اسرائیلی سرزمین پر ہونے والے اس معاہدے میں بہت خوشی کا اظہار کیا گیا۔ بے شمار رنگ برنگے غبارے ہوا میں اڑائے گئے اور بہت بڑی تقریب کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں امریکہ کی صفِ اوّل کی تمام قیادت موجود تھی۔ یہ دراصل خوشی کا اظہار تھا کہ اردن کی قیادت کو اسرائیل نے گویا اپنی سرزمین پر کھینچ کر اپنی مرضی کی شرائط پر دستخط کروائے ہیں، جب کہ اردن کی قیادت بھی اس سبکی اور شکست خوردگی پر بے حد مسرور تھی۔

اس کے بعد ۵ جولائی ۲۰۰۰ء کو کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر امریکہ، اسرائیل اور فلسطین کی سربراہی کانفرنس بھی منعقد ہوئی، جو حسبِ معمول ''نشستند، گفتند، برخاستند'' کے مصداق اختتام پذیر ہوئی۔ کم و بیش ایک صدی سے جاری اس مذاکرات اور معاہدوں کے کھیل میں اُمت کی چار نسلوں نے کیا پایا؟ یہ نوشتۂ دیوار ہے جو چاہے پڑھ لے۔ گاجر مولی کی طرح کٹتے ہوئے بے یار و مددگار اور وطن سے دور بے گھر فلسطینی آج بھی امن کے لمحے لمحے کو ترس رہے ہیں۔

جون ۲۰۰۶ء میں اسرائیل کے دو فوجیوں کے اغوا کے بعد اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر دیا۔ تیس دن سے زیادہ عرصے پر محیط جارحیت میں پورا لبنان راکھ کا ڈھیر بن گیا اور ہزاروں لوگ شہید ہوئے جبکہ بہت سے بے گھر۔ اُس وقت صرف حزب اللہ جیسی چھوٹی جماعت نے اسرائیل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ تیس دن سے زیادہ جاری رہنے والی اس لڑائی میں ایک طرح سے مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی فوجی طاقت کو حزب اللہ کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۴/ اگست ۲۰۰۶ء کی صبح کو جنگ بندی کا اعلان ہوا۔

پوری دنیا کو نظر آنے والے یہ حقائق کیا اُمتِ مُسلمہ کے حکمرانوں سے پوشیدہ ہیں؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے بتا دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ اور کتاب اللہ جن لوگوں سے قتال کا حکم دے رہی ہے اُمت کے غیر منتخب حکمران ان سے صلح کی توقع رکھتے ہوئے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر رہے ہیں۔ اس دنیا پر کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی ہے اور یہ تاریخ کا وہ دورانیہ ہے جس میں بنی اسرائیل نے سب سے زیادہ آسودگی پائی ہے۔ اس کے بعد تاجِ برطانیہ کی حکومت ہو، روس کی سلطنت ہو یا جرمنی کا مردِ آہن ہو، یہودیوں کے لیے ''ہولوکاسٹ'' کی تاریخ ہی تحریر کی گئی ہے۔ کیا اب یہودی یہ ثابت

کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسی سلوک کے مستحق ہیں؟ مسلمانوں کے ہاں اب بھی بحیثیت انسان تمام انسانوں کا احترام موجود ہے‘ خواہ وہ کسی رنگ ونسل اور مذہب وعلاقے سے متعلق ہوں‘ اور ہم پوری ذمہ داری اور وثوق سے کہتے ہیں کہ اس دنیا پر اسلام کی حکومت اور نبی آخر الزماں ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع ہی امن کا باعث بن سکتا ہے۔

اسرائیل کا قیام صریحاً ایک ناجائز اور زیادتی پر مبنی عالمی پردھان منتریوں کا مکروہ فعل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی ہمارے مکان کے ایک حصے پر زبردستی قبضہ جما لے اور پھر کہے کہ مجھے اپنا پڑوسی مان لو اور میرے حقوق ادا کرو۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں جب سلطنت عثمانیہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی تو یہودیوں نے سلطان کو اس کا سارا قرضہ اتارنے اور اس سے مزید تر رقم دینے کی پیشکش کی‘ صرف اس شرط پر کہ انہیں فلسطین میں رہنے کی جگہ دے دی جائے۔ سلطان کا عثمانی خون جوش مار گیا‘ اُس نے اپنی سلطنت کا زوال قبول کر لیا لیکن یہ ذلّت آمیز رقم لینے سے انکار کر دیا۔ یورپ نے ہمیشہ کی طرح بڑی آسانی سے مسلمانوں کے اندر سے ہی ایسے غدار تلاش کر لیے جو ان کی سازشوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار تھے اور دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد فلسطین کا ایک علاقہ یہودیوں کو دے دیا گیا۔

اسرائیل کا قیام نہ صرف اُمّتِ مُسلمہ کے لیے بلکہ عالمی امن کے لیے بھی ایک سلگتا ہوا مسئلہ اور رِستا ہوا زخم ہے۔ اسرائیل نے مشرقِ وسطیٰ سمیت پوری دنیا میں اپنے جاسوسی اور دہشت گردی کے مراکز قائم کر رکھے ہیں‘ پوری دنیا کی معیشت اس سختی کے ساتھ یہودیوں کے ہاتھ میں ہے کہ کوئی معجزہ یا کوئی خونریز انقلاب ہی اس عالمی معیشت کو پنجۂ یہود سے آزاد کرا سکتا ہے۔ پوری دنیا میں پیدا ہونے والا کم وبیش ہر بچہ ان کا مقروض ہے اور پوری دنیا کے باسی کسی نہ کسی طرح اس سود خور برادری کے ہاتھوں مقروض ہیں۔ عالمی میڈیا بھی ان کی ریشہ دوانیوں سے قطعاً محفوظ نہیں‘ اور ایک سوچے سمجھے طریقے سے فرضی خبریں اور جھوٹی افواہیں اس سرعت کے ساتھ پوری دنیا میں چند گھنٹوں کے اندر اندر پھیلا دی جاتی ہیں کہ جن کا حقیقت سے دُور دُور تک کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

فلسطینیوں کو اللہ تعالیٰ ہمت دے کہ وہ آج تک یہود کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ آج ان کی چوتھی نسل یہود کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑی ہے۔ آئے روز یہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ

فلسطینی نوجوان پتھروں سے اسرائیلی ٹینکوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اسرائیلی طیّارے جب چاہیں فلسطینیوں کی بستیوں پر اندھا دھند بمباری کرتے ہیں‘ اسرائیلی فوج آئے دن فلسطینیوں پر سیدھی گولیاں چلاتی ہے‘ لیکن گزشتہ پون صدی کی قربانیاں فلسطینیوں کی ہمت واستقلال اور استقامت میں کوئی لرزش پیدا نہیں کر سکیں۔ اگرچہ فلسطینیوں کے ایک گروہ نے مغرب کے رنگ میں رنگ کر یہودیوں سے مذاکرات کے ذریعے امن کی بھیک مانگنا شروع کر رکھی ہے‘ لیکن اب انہیں احساس ہوتا چلا جا رہا ہے کہ یہود کو برابری کی سطح پر لانا کتنا نقصان دہ ہے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فیصلہ دے دیا ہے کہ یہود ونصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے‘ اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ان کے خلاف قتال کیا ہے اور قرآن نے حکم دیا ہے کہ ان سے لڑو یہاں تک کہ یہ چھوٹے ہو کر رہیں۔

فلسطینیوں کے ایک گروہ نے اگرچہ مغرب کی غلامی قبول کر لی ہے اور انہی کے رنگ میں رنگے گئے ہیں‘ امریکہ اور یورپ نے اپنے ان حواریوں کو نوازا بھی بہت ہے‘ عالمی میڈیا‘ اخبارات اور امریکہ ویورپ کے حکمرانوں نے اس مغرب نواز گروہ کو فلسطینیوں کا نمائندہ گروہ قرار دینے کی بہت کوشش بھی کی ہے‘ لیکن اس گروہ کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنے چاہنے والے ہمیشہ مسلمانوں کے اندر سے مل جاتے رہے ہیں۔ کم وبیش نصف صدی سے مقتدر اس گروہ نے فلسطینیوں کے خون کے سودے ہی کیے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے جن لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا تھا یہ گروہ ان سے مذاکرات اور صلح کے راستے ہموار کرتا رہا ہے اور دامن پھیلا پھیلا کر ان سے امن کی بھیک مانگتا رہا ہے‘ جس کے نتیجے میں آج فلسطین کے حالات اس انجام تک پہنچے ہیں۔

اس گروہ کی مسلسل ناکامیوں کے بعد گزشتہ انتخابات میں فلسطینیوں نے اپنے حقیقی نمائندے چُنے اور ’’حماس‘‘ بہت بھاری اکثریت سے پورے فلسطین میں کامیاب ہو کر ابھری۔ عالمی طاقتوں نے ان کا راستہ روکنے کی بہت کوشش کی‘ ان کی مالی امداد بند کر دی‘ سفارتی تعلقات کی آہنی دیوار ان کے سامنے کھڑی کر دی اور دیگر انتظامی مشکلات کا انبوہ کثیر ان کے مدِّمقابل لا کھڑا کیا‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد ہر معاملے میں ان کے شاملِ حال رہی اور وہ کامیابی سے اپنے قدم آگے بڑھاتے رہے۔ ان کی فہم وفراست سے یہود ونصاریٰ اس حد تک گھبرائے

کہ اپنے پروردہ گروہ کے ذریعے سے ان کو معزول کر کے جمہوری حکومت کو غیر جمہوری طریقوں سے برطرف کر دیا۔

اس کے باوجود بھی ’’حماس‘‘ کے پائے استقامت میں لرزش نہ آئی اور اپنے مخصوص علاقے ’’غزہ‘‘ میں یہ لوگ ثابت قدم رہے۔ غیر جمہوری راستوں سے بھی جب طاغوت کو ناکامی ہوئی تو کم و بیش گزشتہ ایک سال سے غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا اور اس طویل عرصے میں ’’غزہ‘‘ کی مکمل ناکہ بندی کر دی گئی۔ پانی اور بجلی بند کرنے کے علاوہ خوراک اور دوائیں تک بھی ان تک نہ پہنچنے دی گئیں۔ ایران نے دوائیں پہنچانے کی کوشش کی تو مصر نے راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ یہ ننگِ ملّت مسلمان حکمرانوں کا مکروہ کردار ہے۔ لیکن سلام ہے حماس کی اس پوری بستی کو کہ جس نے ایک سال کے طویل عرصے میں اپنے بچوں کی بھوک سے لبریز چیخیں سنیں‘ اپنے مریضوں کی دوائیوں سے محروم آہیں برداشت کیں اور اپنے بزرگوں کو محض اللہ تعالیٰ کے سہارے ہر دنیاوی آسائش سے محروم رکھ کر ان کے درد کو برداشت کیا‘ لیکن اپنے ایمان‘ اپنے مقصد‘ اپنی قیادت اور اپنے وطن کے ساتھ مخلص و ہمدرد رہے۔

حیرت تو یہ ہے کہ اقوام متحدہ جیسا ادارہ بھی کئی نشستیں کر چکنے کے باوجود بھی ابھی تک کوئی واضح پالیسی سامنے نہیں لا سکا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ کم و بیش ایک ہزار قراردادیں ہیں جو اسرائیل کے بارے میں منظور کی گئیں‘ لیکن آج تک ایک پر بھی نہ اسرائیل نے عمل کیا اور نہ ہی کسی عالمی طاقت نے اس طرف توجّہ کی۔ قرارداد منظور ہو جاتی ہے اور آگ اور خون کا کھیل بھی جاری رہتا ہے۔ دوسری طرف عراق کے لیے چوبیس گھنٹے کی مختصر مدت میں بتیس قراردادیں منظور کرا کے فی الفور نافذ بھی کر دی گئیں۔ بوسنیا کے مسلمانوں کے لیے جتنی بھی قراردادیں منظور ہوئیں ان میں سے صرف ایک پر عمل ہوا کہ بوسنیا کے مسلمانوں کو اسلحہ نہ پہنچنے دیا جائے‘ بس! گویا ع ’’جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے!‘‘ اب مسئلہ فلسطین کا حل یہ بتایا جا رہا ہے کہ حماس کو غیر مسلح کر دیا جائے۔

غیروں کے شکوے کیا کریں‘ خود مسلمان حکمرانوں کا کیا کردار ہے اور خاص طور پر عرب حکمرانوں کا؟ سینکڑوں لوگ تہ تیغ ہو جاتے ہیں اور عرب لیگ یا او آئی سی کے ایوان نشستند‘ گفتند‘ برخاستند کے مصداق اپنا کیا دھرا سمیٹ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شاید آج اُمّت کے

حکمران اُمّت کے اصل نمائندے نہیں‘ یا انہیں یہ ڈر ہے کہ جذبۂ جہاد سے معمور سچے مسلمان اگر اسرائیل‘ امریکہ اور بھارت سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے مسلمان حکمرانوں کا احتساب شروع کر دینا ہے۔ بہر حال یہ تو ہونا ہی ہے کہ نوشتہ تقدیر یہی ہے کہ مکافاتِ عمل پوری ہو کر رہتی ہے‘ لیکن ہم منتظر ہیں ایک بار پھر اسی نتیجہ کے جو آج سے کچھ ہی عرصہ پہلے حزب اللہ کے ہاتھوں اسرائیل بھگت چکا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ اب کے بار حماس کے مجاہدین اس صہیونی فوج کے دانت کھٹے کریں گے۔ اور وہ دن دور نہیں جب حقیقی مسلمان قیادت ہی اُمّت کی حکمران ہو گی اور اُمّت کا سورج مشرق سے طلوع ہو کر اپنے نصف النہار تک پہنچے گا اور نبی آخر الزماں ﷺ کی دعائیں اور پیشین گوئیاں رنگ لائیں گی۔

فلسطینیوں کا پوری انسانیت پر عام طور پر اور اُمّتِ مُسلمہ پر خاص طور احسان ہے کہ وہ عالمی امن کے دشمنوں کے ساتھ ایک طویل اور تاریخ ساز جنگ لڑ رہے ہیں۔ پوری دنیا بھی ان فلسطینیوں کے ہاتھ مضبوط کر سکتی ہے‘ اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعے بھی‘ لیکن یہ شاید مشکل ہو‘ البتہ یہود کی مصنوعات کے استعمال کو ترک کر کے یہود کی معیشت پر کاری ضرب لگائی جا سکتی ہے۔ اللہ کرے وہ دن آئے کہ اُمّتِ مُسلمہ کے حکمران اُمّت کے دوست اور دشمن کی پہچان کریں اور اپنے اقتدار کی بجائے اُمّت کے وسیع تر مفاد میں سخت سے سخت فیصلے کر جائیں‘ اگرچہ انہیں کیسی ہی قربانی دینی پڑے‘ تاکہ عالمِ انسانیت ان استحصالی کرداروں سے نجات پا سکے۔

❀❀❀

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے   اشاعت عام: 30 روپے

چند مشہور عربی تفاسیر اور اُن کی خصوصیات (۲)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۴) الکشّاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل (المعروف تفسیر کشّاف)

اس کے مؤلف علّامہ ابوالقاسم، جاراللہ محمود بن محمد بن زمخشری ہیں۔ آپ کی پیدائش ۴۶۷ء میں زمخشر (خوارزم) کے مقام پر ہوئی۔ آپ کا خاندان تقویٰ اور نیکی میں مشہور تھا اور والد بزرگوار بڑے عالم، زاہد اور ادیب تھے۔ اوائل عمر میں آپ کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی، یہ دیکھ کر والد نے چاہا کہ آپ کو کوئی ایسا کام سکھا دیں جو بیٹھنے سے متعلق ہو۔ چنانچہ ان کا خیال آپ کو درزی کا ہنر سکھانے کا ہوا۔ علّامہ زمخشری کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے تحصیلِ علم کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر آپ کے والد ماجد بہت خوش ہوئے اور چھوٹی عمر میں ہی آپ کو حصولِ علم کے لیے بخارا چھوڑ گئے جو کہ علم وادب کا مرکز تھا۔ نظام الملک کے دور میں کسی ناراضگی کی وجہ سے والد صاحب کو نظر بند کر دیا گیا اور مال ومتاع بھی چھن گیا۔ گھر میں مفلوک الحالی کا دور دورہ ہو گیا اور اہل خانہ کے ساتھ علّامہ کی ابتدائی زندگی بھی عسرت میں گزری۔ قید خانے میں ہی آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا، لیکن علّامہ زمخشری تحصیل علم کی وجہ سے طویل مسافت پر ہونے کی بنا پر جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔ اس موقع پر آپ نے ایک دردناک مرثیہ لکھا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ علّامہ کی پارسا والدہ بھی چل بسیں۔

علّامہ زمخشری کی زندگی پر سب سے گہرا اثر جس شخصیت نے ڈالا وہ استاد ابومضر محمود بن جریر الضبی تھے، جو لغت ونحو اور ادب میں یکتائے روزگار تھے، لقب فرید العصر تھا۔ یہ صرف استاد اور شاگرد کا روایتی تعلق نہ تھا، بلکہ الضبی نے زمخشری کو نہ صرف ساتھ رکھا بلکہ اپنے عزیز شاگرد کی تنگ

دستی اور مشکلات میں مدد بھی کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ شاگرد بھی استاد کے رنگ ہی میں رنگا گیا۔ الضبی خود بھی معتزلی تھے، اس لیے علّامہ بھی معتزلہ کے سانچے میں اچھی طرح ڈھل گئے، اور ساری عمر اس کے پُرجوش مبلّغ رہے۔ علّامہ زمخشری نے بغداد میں قیام کر کے شیخ الاسلام ابومنصور نصر الحارثی اور دیگر اساتذہ سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ نیز خراسان، اصفہان اور مکّہ ومدینہ کے بھی کئی علمی اسفار کیے۔ مکّہ مکرمہ میں آپ مجموعی طور پر پانچ سال مقیم رہے۔ عشقِ الٰہی کی بنا پر ’جاراللہ‘ لقب پایا۔ یہیں حدودِ حرم میں علّامہ زمخشری نے اپنی تفسیر مکمل کی۔ مکّہ سے واپسی پر جرجانیہ کے مقام پر ۵۳۸ھ میں علم وفضل کا یہ آفتاب غروب ہو گیا، آپ کی وفات پر بہت سے مرثیے کہے گئے۔

علّامہ زمخشری نہ صرف مشہور مفسر، محدث، فقیہہ، متکلّم لغت اور صَرف ونحو کے ماہر ادیب وشاعر تھے، بلکہ فصاحت وبلاغت اور خطابت میں بھی آپ کا بلند مقام تھا۔ الزرکلی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں: کان من ائمة العلم بالدین والتفسیر واللغة والادب۔ علّامہ ابن خلدون بھی آپ کو علم کلام میں یکتائے روزگار مانتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کلامی مسائل کے حل کرنے میں بعد کی تمام تفاسیر آپ کی مرہونِ منّت ہیں۔ البتہ انہیں اس بات کا شکوہ ہے کہ اعتزالی عقائد کی بنا پر آپ کا قدم انصاف سے کچھ ہٹ گیا ہے، اس لیے اہلِ سُنّت کے لیے یہ زیادہ مفید نہیں ہے، البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کلامی مسائل کے ساتھ فصاحت وبلاغت میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ دراصل قاری اگر مسلکِ اہلِ سُنّت سے بخوبی واقف اور اس کے دلائل وترجیحات کے بارے میں بھی بنیادی معلومات رکھتا ہو تو وہ تفسیر کشّاف سے بخوبی فیض یاب ہو سکتا ہے۔

تاج الدین سبکی کے نزدیک الکشّاف ایک عظیم کتاب اور اس کا مصنف اپنے فن کا امام ہے، لیکن ایک نقص ہے کہ صاحبِ کشّاف بدعت کی طرف مائل ہے اور علانیہ طور پر اس کا اظہار بھی کرتا ہے، یہ بات بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ کے حق میں سوئے ادب کے مترادف ہو جاتی ہے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب (تفسیر) علوم عربیہ اور علوم ادبیہ میں سند ہے، البتہ منقولات میں اس کا پایہ بلند نہیں اور مسلک اعتزال کی تائید کی گئی ہے۔ یہ علماء میں نہایت مشہور ہے، اگر اس میں اعتزال کی باتوں اور روایات میں زیادہ احتیاط ہوتی تو بے نظیر کتاب تھی، تاہم بسا غنیمت ہے۔ علّامہ ابن المنیر الاسکندری نے اس پر ”کتاب الانتصاف“ لکھ کر مسلک اعتزال کی باتوں پر گرفت کر کے انہیں درست کر دیا ہے۔

کشاف کی خصوصیات مختصراً درج ذیل ہیں:

(۱) چونکہ علّامہ زمخشری خود مسلک اعتزال پر کاربند تھے‘ اس لیے آپ نے اپنی تفسیر میں بھی معتزلہ کے مندرجہ ذیل اصولِ خمسہ کو مدِّنظر رکھا ہے:

(ا) التوحید (ب) العدل (ج) الوعد والوعید

(د) المنزلة بین المنزلتین (ہ) امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(۲) علّامہ نے اپنی تمام فکری‘ علمی اور عقلی ریاضت کو مسلکِ اعتزال کی خدمت میں صرف کیا ہے اور ہر پہلو سے اسے کمک پہنچائی ہے۔

(۳) اس میں لغت ونحو سے خوب کام لیا گیا ہے اور ہر لفظ کے وہ معنی اختیار کیے گئے ہیں جس سے مسلک اعتزال کو تقویت پہنچ سکے۔

(۴) علّامہ زمخشری نے قرآن پاک کی مختلف قراءات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور وہی قراءت اختیار کی ہے جو ان کے مسلک کے لیے سودمند ہو‘ چاہے وہ غیر متواتر ہی کیوں نہ ہو۔

(۵) آپ نے علم معنی و بیان کو بھی خوب استعمال کیا ہے۔ جو آیت قرآنی ظاہراً آپ کے مسلک کے خلاف ہو‘ اس کی تاویل کر کے مجازی معنی پہنا دیے گئے ہیں اور کہہ دیا گیا ہے کہ یہ آیت باب مجاز سے ہے۔

(۶) اس تفسیر میں ضعیف اور موضوع تک احادیث سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے اور جو حدیث اعتزالی مسلک کے خلاف ہو‘ اس میں تاویل کی گنجائش نکالی گئی ہے۔

(۷) علّامہ نے اسلوب تمثیل وتخیل سے بھی کام لیا ہے اور عقیدۂ توحید کے ثبوت کے لیے یہ بھی ان کے مددگار ہیں۔

(۸) ایک بات کو تو علّامہ زمخشری کے مخالفین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ادبیت اور فصاحت وبلاغت کے حوالے سے اس تفسیر کی عربی میں کوئی نظیر نہیں۔

(۹) علّامہ نے اپنی تمام فکری ریاضت اور فلسفہ ومنطق کو قرآنی آیات کے ایسے معانی پیدا کرنے میں استعمال کیا ہے جس سے مسلکِ اعتزال کی بخوبی خدمت ہو سکے۔ اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار عقل ہے۔ گویا تفسیر بالرائے ’’الکشاف‘‘ کا ایک خصوصی وصف ہے۔

اس تفسیر کے مطالعہ میں یہ نکات ذہن میں رہنے چاہئیں: اوّل کہ جو آیت مسلک اعتزال

کے خلاف ہے اسے کلامِ طویل اور تاویلات رکیک سے موافق بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوم کہ اہل سُنّت والجماعت کے بارے میں سخت سست الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سوم کہ اولیاء اللہ کے حوالے سے بھی طعن وتشنیع سے کام لیا گیا ہے۔ اپنی کمزوریوں کے باوجود تفسیر کشاف مفسرین میں مقبول رہی ہے‘ کسی نے اس کی شرح لکھی‘ کسی نے تلخیص‘ کسی نے حاشیہ آرائی‘ کسی نے مدح کی اور کسی نے تنقید۔ مشہور حواشی میں قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی‘ فخر الدین احمد بن حسن جاربردی‘ شرف الدین حسن بن محمد طیبی‘ علّامہ سعد الدین تفتازانی اور سید شریف علی بن محمد جرجانی کے حواشی کا شمار ہوتا ہے۔

علّامہ زمخشری چونکہ اہل وعیال کے بکھیڑوں سے بالکل آزاد تھے‘ اس لیے آپ کی زندگی کا ہر لمحہ علم وادب کی تحصیل اور خدمت میں بسر ہوا۔ وہ اپنی تصانیف اور تلامذہ ہی کو بہترین اولاد خیال کرتے اور ان کی ہی خدمت میں لگے رہتے۔ مختلف علوم پر آپ نے پچاس کے لگ بھگ کتابیں تحریر کیں۔ چند مشہور میں اطواق الذھب فی المواعظ‘ اساس البلاغة فی اللغة‘ نیز الرسالة الناصحة کا شمار ہوتا ہے۔

(۵) انوار التنزیل واسرار التاویل

(المعروف تفسیر بیضاوی)

اس کے مؤلف کا نام قاضی ابوالخیر ناصر الدین عبداللہ بن عمر بن محمد بیضاوی ہے۔ آپ شیراز کے ایک نواحی گاؤں بیضاء میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت اور ابتدائی زندگی کے بارے میں مصدقہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ چونکہ آپ کے والد ماجد شیراز کے قاضی القضاۃ تھے‘ اس لیے لامحالہ ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی ہو گی۔ والد کے ساتھ علّامہ بیضاوی کے دادا بھی قاضی القضاۃ رہے تھے‘ سو آپ کے نام کے ساتھ بھی قاضی کی نسبت لگ گئی۔ مختلف علماء سے تحصیلِ علم کے بعد علّامہ بیضاوی بھی شیراز میں ہی قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کر دیے گئے۔ ایک عرصے کے بعد علّامہ بیضاوی اس منصب سے علیحدہ ہو کر تبریز تشریف لے گئے‘ جہاں کے حاکم کو جب آپ کے علم وفضل کا پتہ چلا تو اس نے بھی آپ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کر دیا۔ یہیں کچھ عرصہ کے بعد ۶۸۲ھ یا ۶۸۵ھ میں علاوہ بیضاوی انتقال فرما گئے۔ آخر عمر میں آپ نے شیخ محمد

بن محمد الکنجانی کی صحبت مکمل طور پر اختیار کر لی۔ اپنے مرشد شیخ محمد بن محمد الکنجانی کی آخری آرام گاہ کے برابر علّامہ بیضاوی کو دفن کیا گیا۔

علّامہ بیضاوی کے خاندان میں دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ تقویٰ‘ زہد اور انکساری کی صفات بھی پورے طور پر پائی جاتی تھیں۔ تاج الدین سبکی نے طبقات الکبریٰ میں آپ کے بارے میں عالم‘ فاضل‘ فقیہہ اور زاہد کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ زرکوب شیرازی نے علّامہ بیضاوی کو امام ائمہ مجتہدین اور افضل المتاخرین کے القاب سے یاد کیا ہے۔ اگرچہ آپ شافعیؒ المسلک تھے مگر دوسرے مسالک کی مستحسن باتوں کو بھی بلا جھجک قبول کر لیتے۔ جو بات شافعی مسلک میں بھی قابل قبول نہ لگتی تو اسے چھوڑ دیتے۔ علم و فضل والا گھرانہ ہونے کی بنا پر علّامہ بیضاوی نہ صرف مفسّر‘ محدث‘ فقیہہ اور مؤرخ تھے‘ بلکہ علم معانی و بیان‘ عربی لغت اور فصاحت و بلاغت میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس تفسیر کی کچھ اہم خصوصیات درج کی جاتی ہیں:

(۱) تفسیر بیضاوی دیکھنے میں ایک ہے لیکن درحقیقت بہت سی عظیم الشان تفاسیر کا لُبِ لُباب اور تلخیص ہے۔ اسرار کلام اللہ‘ حکمت و کلام اور علوم عقلیہ سے تعلق رکھنے والے مباحث تفسیر کبیر سے لیے گئے ہیں۔ قواعد عربیہ اور معانی و بیان سے تعلق رکھنے والے موتی تفسیر کشّاف سے ماخوذ ہیں۔ لغاتِ قرآن کی تحقیق میں مفردات القرآن از امام راغب اصفہانی سے مدد لی گئی ہے۔ ان تمام لطیف اور دقیق مباحث کو جس اختصار اور جامعیت کے ساتھ علّامہ بیضاوی نے بیان کیا ہے‘ وہ اپنی نظیر آپ اور ایک عالم اس کا معترف ہے۔ تفسیر بیضاوی نے گویا اپنے سے پہلے کی تمام تفاسیر سے بے نیاز کر دیا ہے۔

(۲) اس میں حدیث و فقہ‘ آثارِ صحابہؓ و تابعینؒ کے ساتھ فقہ‘ فلسفہ و حکمت‘ زبان و ادب اور معانی و بیان کے جواہر ریزے بھی ملتے ہیں۔

(۳) چونکہ علّامہ بیضاوی کا شمار مخالفین اعتزال میں ہوتا ہے اس لیے آپ نے جابجا تفسیر کشّاف کے اعتزالی مضامین کا رد کیا ہے۔ سوئے ادب کے لحاظ سے کہیں بھی علّامہ زمخشری کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ان کے تفسیری نکات کی تردید کی گئی ہے۔

(۴) بلاغت میں بھی یہ تفسیر بہت اونچے پائے کی ہے اور بہت کم الفاظ میں بہت بڑے مضامین سمو لیے گئے ہیں۔

(۵) تفسیر بیضاوی میں نحوی مباحث پر بہت توجہ دی گئی ہے۔ اکثر اوقات علّامہ بیضاوی نکاتِ نحو پر ضرورت سے زیادہ ہی زور صرف کر دیتے ہیں۔ اس لیے بعض علماء کو یہ کہنے کا موقع ملا ہے کہ تفسیر بیضاوی تو تفسیر کی بجائے نحو لگتی ہے۔

(۶) اس میں قرآن پاک کی مختلف قراءتوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔

(۷) ایک بات کھٹکتی ہے کہ فضائل سور میں کہیں کہیں ضعیف احادیث بھی آ گئی ہیں۔

(۸) اسرائیلی روایات اس تفسیر میں بہت کم ہیں۔ اگر کوئی روایت بیان بھی ہوئی ہے تو ساتھ ہی علّامہ بیضاوی نے اس سے متنبہ بھی کر دیا ہے۔

(۹) اس تفسیر میں کئی جگہ قدیم عربی اشعار بھی بطور استشہاد پیش کیے گئے ہیں۔

(۱۰) تفسیر بیضاوی میں کئی جگہ فلسفیانہ اور کلامی بحثیں بھی آ گئی ہیں جو کہ صاحبِ تفسیر کے ان مضامین پر گرفت کی دلیل ہیں۔

(۱۱) اس تفسیر کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ علّامہ بیضاوی ایک آیت کی تفسیر میں دیگر آیاتِ قرآنیہ سے مدد لیتے ہیں اور دلائل میں قرآنی حوالوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔

بہرحال تفسیر بیضاوی ہر دور کی مقبول اور متداول تفسیر رہی ہے۔ ہر زمانے کے مفسّرین اور علماء اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ کوئی چالیس کے قریب حواشی اس تفسیر پر لکھے گئے ہیں‘ جن میں حاشیہ شیخ قاضی زادہ‘ حاشیہ شہاب اور حاشیہ قونوی زیادہ مقبول ہیں۔ اسی طرح شروح میں شرح شیخ جرجانی اور شرح امام جلال الدین سیوطی معروف ہیں۔ مدارس اسلامیہ میں اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر اس تفسیر کے چیدہ چیدہ حصے شامل نصاب ہیں۔ تفسیر بیضاوی کے بارے میں حسین الذہبی لکھتے ہیں: فالکتاب مِن اُمّھات کُتب التفسیر۔ مشہور مستشرق نولڈیکی کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر اہلِ سُنّت کے ہاں بڑی مقبول بلکہ قریب قریب مقدس خیال کی جاتی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا (دائرۃ المعارف) برٹانیکا کے مطابق تفسیر بیضاوی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی تفسیر ہے۔

علّامہ بیضاوی کی دیگر مشہور کُتب میں منہاج الوصول فی علم الاصول‘ شرح مصابیح اور نظام التواریخ (ابتدائے آفرینش سے لے کر ۶۷۴ھ تک کے حالات اور ایران کے واقعات پر مشتمل) شامل ہیں۔ تفسیر بیضاوی کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

(۲) رُوح المعانی فی تفسیر القرآن والسّبع المثانی
(المعروف تفسیر روح المعانی)

علّامہ ابوثناء شہاب الدین سید محمود بن عبداللہ آفندی آلوسی اس تفسیر کے مؤلف ہیں۔ آپ بغداد کے محلہ کرخ میں ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ کے آباء واجداد آلوس نامی ایک قصبے (جو شام اور بغداد کے درمیان واقع ہے) سے ہجرت کر کے بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے' اس لیے آلوسی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ اس کے بعد شیخ خالد نقشبندی اور شیخ علی سویدی سے استفادہ کیا۔ اوائل عمر سے ہی آپ کو تحصیل علم کا وافر شوق تھا اور پختہ حافظے کے مالک تھے۔ جلد ہی آپ مسند درس وتدریس پر رونق افروز ہوئے اور ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا کام بھی شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے علّامہ آلوسی کے درس کا شہرہ پھیل گیا اور طلبہ جوق در جوق حاضر ہونے لگے۔

۱۲۴۸ھ میں آپ کو مسندِ افتاء پر فائز کر دیا گیا اور پندرہ سال تک علّامہ آلوسی فقہ حنفی کے مطابق فیصلے کرتے اور فتوے دیتے رہے۔ پھر آپ نے اس ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کر لی اور قرآن پاک کی تفسیر لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ اس کی تکمیل پر آپ ۱۲۶۷ھ میں عثمانی خلیفہ اسلام سلطان عبدالحمید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تفسیر انہیں ہدیہ کی۔ سلطان نے خوشی کا اظہار کیا۔ ترکی میں دو سال قیام کرنے کے بعد ۱۲۶۹ھ میں علّامہ آلوسی واپس بغداد تشریف لے آئے۔ آپ نے ۱۲۷۰ھ میں دارالبقاء کی طرف رختِ سفر باندھا اور کرخ میں ہی شیخ معروف کرخی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

اپنی تفسیر کے مقدمہ میں علّامہ آلوسی رقم طراز ہیں کہ ابتدائی زندگی سے ہی مجھے قرآن پاک سے شغف ہو گیا۔ اس کے معانی اور اسرار ورموز حاصل کرنے کے لیے میں کھیل کود اور دوستوں سے دور رہتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے چھوٹی عمر میں ہی مجھ پر حقائقِ قرآنی کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ مجھے ایک شب جمعہ کو خواب آیا' جس کی تعبیر قرآن پاک کی تفسیر لکھنے پر منتج ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر چونتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ تفسیر مکمل کر لینے کے بعد نام تجویز کرنے کے لیے اسے علی رضا پاشا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انہوں نے تفسیر دیکھ کر اس کا نام

'روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی' تجویز کر دیا۔ علّامہ آلوسی نہ صرف مفسر بلکہ محدّث' فقیہہ' مجتہد' متکلّم اور فلسفی بھی تھے۔ النفحات القدسیہ فی المباحث الامامیۃ اور شرح السّلم (منطق میں) کا آپ کی دیگر مشہور تصانیف میں شمار ہوتا ہے۔

اس تفسیر کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) روح المعانی اپنے سے پہلی تفاسیر کا ایک مکمل خلاصہ ہے۔ اس سے ہر قسم کے اشخاص مثلاً مفسّر' محدّث' فقیہہ' صوفی اور متکلّم یکساں فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ صاحبِ تفسیر روایت کے ساتھ درایت کے بھی جامع ہیں۔

(۲) اس میں مشکلات القرآن کا حل بھی دیا گیا ہے۔

(۳) فصاحت وبلاغت کے نکات بھی اپنے مواقع پر بیان کیے گئے ہیں۔

(۴) علّامہ آلوسی کا صوفیاء میں بھی بڑا مقام ہے' چنانچہ اپنی تفسیر میں آپ نے تصوف اور روحانی اشارات سے بھی کام لیا ہے۔

(۵) اکثر مقامات پر لغوی اور نحوی بحثیں بھی کی گئی ہیں' جو کہ بعض اوقات زیادہ طوالت اختیار کر لیتی ہیں۔

(۶) تکوینی مسائل میں علّامہ آلوسی اہلِ حکمت کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں۔

(۷) ایک محقق کی طرح صاحبِ تفسیر نے دوسرے مفسّرین کی آراء کو بھی بیان کیا ہے۔

(۸) فقہی مسائل میں آپ نے اکثر امام رازی سے اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح علم الاحکام میں کئی جگہ امام شافعی کے اقوال کی تصدیق کی گئی ہے۔

(۹) الفاظِ قرآنی کے معانی میں عربی اشعار سے بھی استشہاد کیا گیا ہے۔

(۱۰) علّامہ آلوسی تفسیر میں آیات کے ساتھ ساتھ اسبابِ نزول کو بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔

(۱۱) قرآن پاک کی مختلف قراءتوں کا بھی ذکر ہوا ہے۔

(۱۲) علّامہ آلوسی سلفی عقیدہ اور سُنّی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے اپنی تفسیر میں معتزلہ' شیعہ اور دوسرے مخالف مسالک کا خوب رد کیا ہے۔ جیسے آیت قرآنی: ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا﴾ (الجمعۃ:۱۱) کی تفسیر میں شیعہ کے موقف کی تردید کی گئی ہے جو کہ وہ صحابہ کرامؓ پر طعن کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خطبے کو چھوڑ کر تجارت میں مشغول ہو جایا کرتے اور یوں نافرمانی اور بے ادبی کے مرتکب ہوتے

تھے۔اس حوالے سے صاحبِ تفسیر نے شیعہ حضرات کی خوب خبر لی ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور کی بات ہے۔ (اس وقت کُفّارِ مکّہ کی طرف سے مدینہ کی معاشی ناکہ بندی کا بندوبست کیا جارہا تھا اور اشیائے ضرورت کمیاب تھیں۔ چنانچہ ایسے ماحول میں جبکہ احکامِ جمعہ بھی پورے واضح نہ تھے' تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا ایک اضطراری اور غیر شعوری حرکت تھی)۔ چنانچہ شیعہ کی طرف سے یہ گستاخی ان کی جہالت اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ صحابہ کرامؓ نے تو حضور پاک ﷺ کی پیروی میں ذرہ بھر کسر بھی نہیں چھوڑی' ہمیں ان کے بارے میں قطعاً سوئے ظن سے کام نہیں لینا چاہیے۔

(۱۳) صاحب تفسیر اسرائیلیات سے مکمل طور پر بیزار اور انہیں لغو قرار دیتے ہیں۔ان روایات کے ناقلین پر بھی علامہ آلوسی نے سخت تنقید کی ہے۔سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل سے متعلق کلام میں عوج بن عنق کا جو طویل قصہ نقل کیا گیا ہے' آپ نے اس کو بے بنیاد فرمایا ہے۔اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سے متعلق اسرائیلی روایات کا بھی رد کیا گیا ہے۔

تفسیر روح المعانی چھ جلدوں اور تیس حصوں میں طبع ہو چکی ہے' اس میں علامہ آلوسی نے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی تحفہ اثناعشریہ سے بھی استفادے کا ذکر کیا ہے۔ علّامہ شافعی مسلک سے تعلق رکھنے کے باوجود اکثر مسائل میں امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے تھے۔ آخری عمر میں طبیعت اجتہاد کی طرف مائل ہوگئی تھی۔

(۷) البَحر المُحِیط (المعروف تفسیر محیط)

اس کے مؤلف شیخ ابوعبداللہ اثیر الدین محمد بن یوسف بن علی بن یوسف اندلسی ہیں۔آپ ابوحیان کے نام سے معروف ہوئے۔ ۶۵۴ھ میں بمقام غرناطہ آپ کی پیدائش ہوئی۔تحصیل علم کے لیے اندلس کے علاوہ افریقہ کے بھی سفر کیے۔ابوحیان کے بقول ان کے اساتذہ کی کُل تعداد ۴۵۰ ہے۔آپ سلف صالحین کے پیروکار تھے۔علّامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ ابن حیان ان علماء میں سے ہیں کہ جن کی تصانیف ان کی زندگی میں ہی مقبول اور ہردلعزیز ہو چکی تھیں۔ علّامہ ابن حیان کا وقتِ آخر ۷۴۵ھ کے دوران قاہرہ میں آ پہنچا اور وہیں مدفون ہوئے۔علّامہ ابن حیان اپنی تفسیر کے بارے میں خود رقم طراز ہیں:

''اور یہ بات میرے ذہن میں بار بار آتی رہی اور میرے افکار پر ابھرتی رہی کہ جب میں

پختگی کی ایسی عمر کو پہنچوں گا' جبکہ انسان خلوت پسند ہوجاتا ہے تو میں خدا کی پناہ حاصل کرتے ہوئے تفسیر قرآن لکھنا شروع کروں گا۔ خدا تعالیٰ نے میری خواہش وقت سے قبل ہی پوری کر دی اور مجھے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی اس طرح توفیق دی کہ مجھے سلطان الملک منصور کے عہد میں مدرسہ میں علم تفسیر پڑھانے کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ یہ ۷۱۰ھ کا آخر تھا اور میری عمر ستاون سال تھی۔''

آپ آگے چل کر فرماتے ہیں: 'بحر المحیط کی تالیف سے قبل میں نے تمام مشہور اور متداول کتبِ تفسیر غور وخوض سے پڑھیں اور ان کا خلاصہ کیا۔''

اس تفسیر کی اہم خوبیاں درج ذیل ہیں:

(۱) تفسیر قرآن کرتے وقت سب سے پہلے مشکل الفاظ کی لغت کا بیان ہوا ہے۔

(۲) اس میں آیات کے شانِ نزول سے بحث کی گئی ہے۔

(۳) آیات کے باہمی ربط کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

(۴) صاحبِ تفسیر نے قراءات شاذہ و مستقلہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۵) علّامہ ابن حیان نے آیاتِ قرآنی کے معانی کی وضاحت کے لیے سلف صالحین کے اقوال سے بھی مدد لی ہے۔

(۶) ادبی نکات کا بھی اس میں بیان کیا گیا ہے۔

(۷) اس تفسیر میں اپنے اپنے مواقع پر فقہائے اربعہ کا مسلک اور ان کے دلائل کی بھی وضاحت آئی ہے۔

(۸) ایک مضمون کی تفسیر مکمل کر کے علّامہ ابوحیان اس کی تلخیص بھی تحریر کرتے ہیں۔

(۹) صاحبِ تفسیر کا رخ تصوّف کی طرف بھی ہے' اس لیے کئی مقامات پر صوفیاء کے اقوال کو بھی ترجیح دیتے ہیں۔

(۱۰) یہ تفسیر دس جلدوں میں ہے۔ بعد میں علّامہ ابوحیان نے خود ہی اس تفسیر کو دو جلدوں میں مختصر کیا اور اس کا نام 'النهر الماد من البحر' رکھا۔علماء میں یہ تفسیر مقبول رہی ہے۔

(۸) جامع احکام القرآن (المعروف تفسیر قرطبی)

اس کے مؤلف کا اسم گرامی امام شیخ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر قرطبی ہے۔اندلس میں پیدائش ہوئی۔مختلف علماء سے تحصیل علم کی' قرآن پاک سے آپ کا بہت گہرا قلبی تعلق تھا۔دیگر علوم

میں بھی کمال کے درجے پر تھے۔ نہایت سادہ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لباس میں بھی بالکل تکلف نہیں تھا۔ علامہ قرطبی نے ۶۷۱ھ میں وفات پائی اور ابن خصیف کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ محمد حسین الذہبی آپ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: کان رحمہ اللہ من عباد اللہ الصالحین والعلماء العارفین' الزاھدین فی الدنیا' المشغولین بما یعنیھم من امور الآخرۃ۔

اس تفسیر کے چند اہم اوصاف کچھ یوں ہیں:

(۱) اس کا انداز محدثانہ ہے۔ مختلف مضامین اور احکامات میں دیگر قرآنی آیات کے ساتھ بکثرت احادیث سے بھی تائیدی دلائل دیے گئے ہیں۔

(۲) ہر آیت قرآنی کی لغوی اور معنوی تشریح کی گئی ہے۔

(۳) آیات سے متعلق احادیث اور اقوالِ صحابہؓ کا بیان ہوا ہے۔

(۴) موقع ومحل کے مطابق امام قرطبی نے مختلف فقہی مسائل کا بھی استنباط کیا ہے۔

(۵) فقہی مسائل اور احکامات میں صاحبِ تفسیر ضمناً امام مالک کے مسلک کی حمایت اور دوسرے مسالک کی تردید کرتے ہیں۔ مگر احتراماً دوسرے ائمہ کا نام نہیں لیتے۔

(۶) اس میں مناسب مواقع پر معتزلہ' قدریہ' روافض اور فلاسفہ کی بھی تردید کی گئی ہے۔

(۷) آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ ساتھ اس تفسیر میں سُنّت وحدیث پر بھی بھرپور بحث کی گئی ہے اور اشکالات کو حل کیا گیا ہے۔

(۸) اس میں مختلف استنباط دلائل' فقہی اقوال پر آراء اور ان پر تبصرہ ومحاکمہ معتدل طریقے سے واضح کیا گیا ہے۔

(۹) کسی ایک قول یا رائے کو اختیار کرنے کی وجوہِ ترجیح کا مفصل اور متوازن بیان ہوا ہے۔

(۱۰) علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں مختلف قصص اور تاریخی واقعات سے قطع نظر کر کے صرف آیاتِ احکام پر ہی زیادہ بحث کی ہے۔

(۱۱) یہ تفسیر بالروایت کی عمدہ مثال ہے۔

یہ تفسیر بارہ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ آپ کی دیگر مشہور تصانیف میں شرح اسماء الحسنیٰ اور کتاب التذکرۃ بامور الاخرۃ بھی شامل ہیں۔ تفسیر قرطبی کو ہر دور کے علماء کی تائید حاصل رہی ہے۔

(۹) تفسیر جلالین

امام جلال الدین محمد بن احمد بن محمد محلی اور امام ابوالفضل جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد سیوطی دو جلیل القدر عالم اس تفسیر کے مؤلف ہیں۔ چونکہ دونوں کے اسماء میں لفظ 'جلال' مشترک ہے' اس لیے ان کی تالیف 'تفسیر جلالین' کے نام سے معروف ہوئی۔ پہلے اس تفسیر کا آخری حصہ سورۃ بنی اسرائیل سے لے کر ختم قرآن تک امام جلال الدین محمد محلی نے تحریر کیا۔ ان کی وفات کے کچھ سال بعد امام جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی نے اسی طرز پر پہلے حصے سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ النحل تک کی تفسیر لکھی۔ دونوں ائمہ کے مختصر حالات درج ذیل ہیں:

(ا) امام جلال الدین محمد محلی: ۷۹۱ھ میں آپ کی پیدائش مصر میں ہوئی۔ استاد بدر محمود اقصرائی' شمس بساطی' علاء بخاری اور دیگر کئی مشہور اساتذہ سے آپ نے تحصیل علم کی۔ اپنی ذکاوت اور فہم کے لحاظ سے آپ مشہورِ زمانہ تھے۔ آپ مختلف علوم وفنون تفسیر' فقہ' نحو' کلام' اصول اور منطق پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ امام جلال الدین محلی ۸۶۴ھ میں سفر آخرت کو روانہ ہوئے۔ آپ کی دیگر مشہور کتب میں شرح جمع الجوامع فی الاصول اور شرح المنہاج فی فقہ الشافعیۃ بھی شامل ہیں۔

(ب) امام جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی: السیوط (مصر) میں آپ ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال سے اوپر عمر تھی کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ شروع سے ہی قرآن مجید کے پڑھنے اور یاد کرنے سے آپ کو خاصا شغف تھا۔ شیخ الاسلام علم الدین بلقینی' شیخ تقی الدین شمنی اور دیگر نامور علماء سے آپ نے مختلف علوم وفنون حاصل کیے۔ بعد میں درس وتدریس اور افتاء میں مشغول رہے۔ چالیس سال کی عمر میں آپ کارِ دنیا چھوڑ کر عبادتِ خداوندی اور ذکر وفکر میں مصروف ہو گئے۔ روضۃ المقیاس میں تا آخر زندگی سکونت اختیار کیے رکھی۔ آپ نے کافی کتابیں مختلف موضوعات پر تحریر کیں۔ علمِ حدیث میں آپ کمال پر تھے۔ امام سیوطی کے بارے میں محمد حسین الذہبی لکھتے ہیں: کان أعلم اھل زمانہ بعلم الحدیث وفنونہ' رجالًا وغریبًا و متنًا وسندًا واستنباطًا لاحکام' ولقد اخبر عن نفسہ انہ یحفظ مأتی الف حدیث۔

۹۱۱ھ میں آپ نے اس دارفانی سے کوچ کیا۔

الدر المنثور فی تفسیر بالماثور اور الاتقان آپ کی مشہور کتابوں میں شامل ہیں۔

تفسیر جلالین کی امتیازی خصوصیات

(۱) اس تفسیر کو اگرچہ دو علماء نے لکھا ہے مگر اس خوبی سے تحریر کیا ہے کہ بالکل پتہ نہیں چلتا کہ یہ تفسیر ایک صاحب کی ہے یا دو صاحبان کی۔ صرف چند ایک مقامات پر تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے' جیسے امام جلال الدین محلی نے سورۃ الحج میں ''الصّٰبِئِیْنَ'' کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہ یہود میں سے ایک فرقہ تھا۔ اور امام جلال الدین سیوطی نے سورۃ البقرۃ میں اس لفظ کی تشریح میں مزید تحریر کیا ہے کہ یا وہ نصاریٰ میں سے ایک فرقہ تھا۔

(۲) اس تفسیر میں بالکل آسان طرز سے واضح طور پر آیاتِ قرآنی کا معنی اور مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

(۳) اختصار و ایجاز اس کی ایک اہم خوبی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یمن کے عالم نے حاجی خلیفہ کو بتایا کہ میں نے قرآن حکیم اور تفسیر جلالین کے حروف شمار کیے تو سورۃ المزمل تک دونوں کو برابر پایا۔

(۴) اس مختصر اور جامع تفسیر میں گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

(۵) صاحبان تفسیر کی تشریحات میں حنفی مسلک کا غلبہ ہے۔

(۶) اسرائیلی روایات اور طویل بحثوں سے اجتناب کیا گیا ہے۔

(۷) فقہی مسائل کا بھی اس میں بیان ہوا ہے۔

(۸) اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر تفسیر جلالین ہر دور کے علماء میں مقبول رہی ہے اور اسلامی مدارس کے نصاب کا لازمی حصہ ہے۔

(۹) 'جلالین' تفسیر بالروایت میں اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

اس تفسیر کے بہت حواشی اور شروح لکھی گئیں' جن میں حاشیۃ الجمل اور حاشیۃ الصاوی اور شروح میں جمالین از ملا علی قاری اور کمالین بہت مقبول اور متداول ہیں۔ کشف الظنون میں ہے کہ اس تفسیر پر شمس الدین محمد بن علقمی نے بھی ایک حاشیہ قبس النیرین کے نام سے تحریر کیا۔

(۱۰) مَعَالِمِ التَّنزِيل (المعروف تفسیر بغوی)

اس کے مؤلف شیخ الاسلام محی السنۃ امام ابو محمد حسین بن مسعود بن محمد الفراء بغوی ہیں' جن کی پیدائش ۴۳۵ھ میں ہوئی۔ آپ علماء کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کو کتاب اللہ اور

حدیث رسولؐ سے بہت زیادہ اشتغال رہا۔ آپ شافعی المسلک' بڑے عابد اور زاہد تھے۔ شیخ قاضی حسین سے آپ نے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ امام بغوی اپنے دور کے مشہور مفسر' محدّث اور فقیہہ تھے۔ عمر بھر سادہ غذا ایک روٹی اور آخری دور میں دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر اس کے ساتھ زیتون ملا کر گزارا کیا۔ مشہور زمانہ حدیث کی کتاب المصابیح آپ ہی کی مرتب کردہ ہے۔ اسی سال کی عمر میں امام بغوی نے ۵۱۶ھ میں آخرت کے لیے رخت سفر باندھا اور اپنے استاد شیخ قاضی حسین کے قرب میں تدفین ہوئی۔ تاج السبکی آپ کے بارے میں رقم کرتے ہیں: كان امامًا جليلًا' وزاهدًا فقيهًا' محدثًا مفسرًا' جامعًا بين العلم والعمل ' سالكًا سبيل السلف' امام بغوی نے مختلف علوم وفنون میں کئی کتب تصنیف کیں۔ آپ کی مشہور تصانیف میں شرح السنۃ' المصابیح اور تہذیب کا شمار ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے چند امتیازی اوصاف درج ذیل ہیں:

(۱) معالم التنزیل (تفسیر بغوی) کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں 'القرآن يفسر بعضه بعضا' کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسے تفسیر القرآن بالقرآن کے مطابق تحریر کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

(۲) تفسیری روایات میں سند کو مکمل طور پر منضبط کیا گیا ہے۔

(۳) اس میں سلف صالحین کے مسلک کو مدّنظر رکھنے کا اہتمام ہوا ہے اور تفسیر کو زیادہ طول نہیں دیا گیا۔

(۴) صاحبِ تفسیر نے گمراہ فرقوں اور غلط باتوں کا ردّ کیا ہے۔

(۵) اس کے ساتھ کچھ بے اصل اور غیر معتبر قصے بھی اس تفسیر میں جگہ پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

(۶) اس میں تفسیر بالروایت کا منہج اختیار کیا گیا ہے۔

(۷) اپنی بہت سی خوبیوں کی بنا پر تفسیر بغوی اہلِ علم میں معروف رہی ہے اور اسلامی مدارس کے نصاب کا لازمی حصہ ہے۔ اس تفسیر کا ترجمہ ہو چکا ہے' شیخ تاج الدین ابو نصر عبدالوہاب بن محمد الحسینی نے تفسیر بغوی کا خلاصہ تحریر کیا ہے۔

❁❁❁

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل

اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'

اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

(جدید نظرثانی شدہ ایڈیشن)

۞ صفحات:360 ۞ قیمت اشاعت خاص:500روپے اشاعت عام:300روپے

۞۞۞

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

۞ صفحات:64 ۞ قیمت اشاعت خاص:50روپے ۞ اشاعت عام:30 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

Feb 2021 Vol.70
Regd. CPL No.115 No.2
Monthly Meesaq Lahore